جلد ۷۹ | مئی ۱۹۷۳ء | عدد ۳

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۷۹	مئی ۱۹۷۳ء مطابق ربیع الآخر ۱۳۹۳ھ	عدد ۳

ماہنامہ ترجمان القرآن

۵ - اے ذیلدار پارک - اچھرہ لاہور

چندہ سالانہ دس روپیہ ——— فی پرچہ ایک روپیہ

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔ پرنٹر: محمد شفیع

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اشارات

کسی اہم کام کا سرانجام پا جانا بلاشبہ کافی حد تک اطمینان کا موجب ہوتا ہے۔ مگر جس انداز سے وہ کام تکمیل کے مختلف مراحل طے کرتا ہے اِسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس کے اندازِ تکمیل ہی سے اس کام کو سرانجام دینے والوں کی نیتوں، ان کے حقیقی عزائم اور اُن کے رجحانات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ آپ اسلام کے بنیادی فریضہ نماز کو ہی لیجئے۔ ایک مسلمان جس انداز سے اس فرض کو انجام دیتا ہے اسے دیکھتے ہوئے اس حقیقت کا پتہ لگانا کچھ مشکل نہیں ہوتا کہ یہ شخص کس جذبہ اور احساس کے ساتھ اس فرض کو سرانجام دے رہا ہے۔ دلوں کا حال تو خدا ہی جانتا ہے مگر دلی کیفیات کی مخفی چنگاریاں اندرونی حرارت کا پتہ دے دیتی ہیں اور جو شخص بھی ان کے قریب ہوتا ہے وہ ان کی گرمی کو لازمی طور پر محسوس کرتا ہے گو وہ ان چنگاریوں کو دیکھ نہیں پاتا۔ خلوص دوسرے جذبات کی طرح ایک ایسا جذبہ ہے جو دوسرے انسانوں میں بڑی سرعت کے ساتھ سرایت کرتا ہے اور اپنے وجود کو اُن سے تسلیم کرواتا ہے۔ کسی قوم کے رہنماؤں کا خلوص اور اُس کی فلاح و بہبود کے لیے اُن کا جذبۂ صادق اور عزمِ راسخ سہانے خواب کی طرح لاشعور کے عالم میں کسی عارضی اور وقتی مسرت کا باعث نہیں بنتے بلکہ اس قوم کے دل و دماغ پر بڑے دور رس نتائج مرتب کرتے ہیں جن کی ضیا پاشیوں سے نہ صرف اس کے شعور کی لوح منور ہوتی ہے بلکہ زندگی کے سارے شعبے جگمگا اُٹھتے ہیں۔

ہمارے ملک کے لیے مختلف حلقوں کی مفاہمت کے ساتھ دستور کا پاس ہو جانا حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف دونوں کے لیے مژدہ جانفزا ہے۔ اور اسے کامرانی کا ایک بہت بڑا مرحلہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ مگر جس انداز سے راہوارِ دستور منزلِ مقصود تک پہنچا ہے اور راستے میں جو مختلف موانع پیش آئے ہیں اور انہیں دور کرنے کے لیے جو جتن کرنے پڑے ہیں اُنہیں دیکھتے ہوئے اس بات کا

بڑی آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کسی نہایت ہی آمرانہ مزاج اور آمرانہ عزائم رکھنے والے آدمی کو بڑی مشکل کے ساتھ اس بات پر آمادہ کیا گیا ہے کہ وہ اس حقیقت کو پوری طرح نہ سہی مگر کسی نہ کسی حد تک تسلیم کرے کہ پاکستانی عوام بھیڑوں کا گلہ نہیں جسے اقتدار کی لاٹھی جس طرف چاہے ہانک کر لے جائے بلکہ صاحبِ ارادہ اور صاحبِ شعور مخلوق کی ایک ایسی اجتماعی ہیئت ہے جو اپنے انسانی حقوق اور فرائض کا کچھ نہ کچھ احساس رکھتی ہے۔ اس حقیقت کو منوانے کے لیے حزبِ اختلاف کو بڑی تگ و دو کرنا پڑی اور سرتوڑ کوششوں کے بعد صدر صاحب اسے ماننے پر آمادہ ہوئے۔

جو لوگ حزبِ اختلاف کے ساتھ اس جدوجہد میں عملاً شریک رہے ہیں یا جنہوں نے اس جدوجہد کا ذرا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے اُن کے لیے اس بات کا سمجھنا کچھ مشکل نہیں کہ حزبِ اختلاف کو اس آزاد سرزمین میں شہریوں کے بنیادی حقوق کے تحفظ کے لیے بالکل اسی طرح ہاتھ پاؤں مارنے پڑے ہیں جس طرح کہ آزادی سے پہلے غیر ملکی آقاؤں کو یہ باور کرانے کے لیے جدوجہد کرنی پڑتی تھی کہ پاک و ہند کی سرزمین میں جو لوگ آباد ہیں وہ بہرحال انسان ہیں اور اس بنا پر وہ بعض ایسے حقوق رکھتے ہیں جنہیں غیر ملکی سامراج نگلنے کا کوئی حق نہیں رکھتا اور اگر وہ ایسا کر رہا ہے تو وہ انصاف اور انسانیت دونوں کا خون کر رہا ہے۔

آزادی کا سورج طلوع ہونے سے پیشتر انسانی حقوق پر غیر ملکی آقاؤں کی یلغار اور باشندگانِ ملک کی طرف سے ان کے تحفظ کے لیے بھرپور جنگ کوئی ایسی صورت حال نہ تھی جسے سمجھا نہ جا سکتا ہو۔ غیر ملکی حکومت کا اپنی سامراجی فطرت کے تحت عوام کے حقوق پامال کرنا خلافِ توقع نہ تھا کیونکہ ان حقوق کو پامال کر کے ہی وہ اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل کر سکتی تھی۔ دوسری طرف اہلِ ملک کو بھی اس بات کا پورا طرح احساس تھا کہ جو قوم سات سمندر پار کر کے بالجبر اس کی سرزمین پر قابض ہوتی ہے وہ فرشتۂ رحمت بن کر تو نہیں آتی بلکہ دیوِ استبداد بن کر نازل ہوتی ہے۔ اور اس کا مدعا ظلم و استحصال ہے۔ وہ جتنی دیر یہاں مسلط رہے گی اس عمل کو جاری رکھے گی۔

آزادی کے بعد حاکم و محکوم کے درمیان اس باہمی آویزش کو از خود ختم ہو جانا چاہیئے تھا اور ملک کے حکمرانوں کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر کے اقتدار کی مسند پر متمکن ہونا چاہیئے تھا کہ وہ کسی دوسری قوم کی

گردن پر مسلط نہیں ہیں بلکہ خود اُن کی اپنی قوم نے امورِ مملکت چلانے کا کام بطور امانت اُن کے سپرد کر رکھا ہے اس لیے اُنہیں اپنی ساری صلاحیتیں قوم کی فلاح و بہبود کے لیے صرف کرنی چاہئیں، اور جان بوجھ کر کوئی ایسا کام نہ کرنا چاہیئے جس سے قوم کے کسی طبقے میں بھی یہ احساس پیدا ہو کہ حکمران امانت میں خیانت کا ارتکاب کر رہے ہیں۔

پھر حکمران طبقے کو یہ بات بھی ہر وقت اپنے پیش نظر رکھنی چاہیئے تھی اور اب بھی رکھنی چاہیے کہ اقتدار کسی فرد یا گروہ کا پیدائشی یا موروثی حق نہیں جس سے وہ کبھی محروم نہیں کیا جا سکتا۔ جمہوریت کے اندر اقتدار بالکل آنی جانی شے ہے۔ آج اگر یہ ایک گروہ اور طبقے کے ہاتھ میں ہے تو کل دوسرے گروہ اور طبقے کے ہاتھ میں آسکتا ہے۔ کسی جمہوری ملک میں اچھے حکمران وہی لوگ ثابت ہوتے ہیں جو نشۂ اقتدار میں بدمست نہیں ہوتے اور ہوش و خرد سے دستبرداری کا اعلان نہیں کرتے بلکہ اقتدار کی مسند پر بیٹھ کر اس حقیقت کو ہمیشہ نگاہ میں رکھتے ہیں کہ اُنہیں کل اس مسند کو چھوڑ کر عوام کی صفوں میں واپس جانا ہوگا۔ اس لیے اُنہیں کوئی ایسا کام نہ کرنا چاہیئے جس سے وہ مسندِ اقتدار چھن جانے کے بعد عوام سے آنکھیں نہ ملا سکیں بلکہ اُنہیں عہدِ اقتدار میں بھلائی کے ایسے کام کرنے چاہئیں کہ کل جب وہ اقتدار سے محروم ہو کر عوام کے سامنے آئیں تو انہیں اُن کی نظر میں عزت و احترام کا ایک ایسا بلند مقام حاصل ہو جو دورِ اقتدار میں بھی انہیں حاصل نہ تھا۔ مسندِ اقتدار کے ساتھ اِس نوعیت کی وابستگی کوئی ایسی چیز نہیں جسے محض خیالی کہہ کر نظر انداز کر دیا جائے۔ جن ممالک میں بھی نظامِ مملکت جمہوری اصولوں اور جمہوری روایات کے مطابق چلایا جاتا ہے وہاں اقتدار کو کوئی ذاتی جاگیر سمجھ کر اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی جاتی بلکہ تختِ اقتدار پر متمکن ہونے والے افراد اس حقیقت کو نگاہ میں رکھ کر ملک کی زمامِ کار سنبھالتے ہیں کہ انہیں قوم نے بعض مقدس عزائم کی تکمیل اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے اقتدار کی قوت فراہم کی ہے اس لیے اُنہیں اس قوت سے پوری طرح فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنی چاہیئے تاکہ عوام میں اُنہیں مقبولیت حاصل ہو اور وہ ایوانِ اقتدار کے اندر اور باہر دونوں جگہوں پر یکساں احترام کی نگاہ سے دیکھے جائیں۔

اقتدار کے بارے میں سیدنا ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک ایسا قول مشہور ہے جو پوری تاریخِ حکمرانی کا تابناک عنوان بن سکتا ہے۔ حضور سرورِ دو عالم کے اس فدائی سے کسی صحابی نے ایک مرتبہ سوال کیا کہ حکمران کس قسم کا ہونا چاہیئے تو اس عارفِ ربانی نے برجستہ کہا کہ حکمران ایسا ہونا چاہیے کہ وہ جب مسندِ اقتدار پر فائز ہو تو عوام اسے اپنے میں سے ایک فرد سمجھیں اور وہ جب مسندِ اقتدار سے ہٹ جائے تو وہ معاشرے میں اس طرح نمایاں

ہو گویا کہ وہ صاحبِ اقتدار ہے ۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس کی عزت و توقیر اس مسند کی رہینِ منت نہ ہو جس پر وہ فائز ہے، بلکہ اس کے ذاتی اوصاف اور اچھے اخلاق کی وجہ سے عوام اسے سر آنکھوں پر بٹھانے کے لیے تیار ہوں ۔ جو لوگ مسندِ اقتدار کو عوام میں اپنی مقبولیت قائم کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں وہ ہمیشہ خود فریبی کا شکار رہتے ہیں کیونکہ جونہی وہ اس مسند سے ہٹتے ہیں بلکہ جس وقت ان کے اقتدار کا سنگھاسن ڈولتا نظر آتا ہے تو لوگ اُن سے آنکھیں پھیر لیتے ہیں ۔ جب واجب الاحترام مسندِ اقتدار ہے نہ کہ وہ فرد جو اس پر براجمان تو لوگوں کو اس بات کی آخر کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ مسند کے بجائے فرد سے اپنے آپ کو وابستہ رکھیں اِلّا یہ کہ فرد ایک ایسی قابلِ قدر شخصیت ہو کہ جس کی وجہ سے مسند کی رونق اور عزت میں اضافہ ہو اور جس کے مسند سے الگ ہو جانے کے بعد اس کا وقار گر جانے کا اندیشہ ہو ۔

اسے ہماری بدقسمتی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ تاریخ نے نوعِ انسانی کو حکمرانی کے بارے میں جو سبق دیا ہے اُسے ہمیشہ بھلانے کی کوشش کی گئی ہے اور اپنی ذاتی خوبیوں کو اپنی مقبولیت کا ذریعہ بنانے کے بجائے تختِ اقتدار کو اپنی سربلندی کا زینہ بنانے کی سعی کی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مہم جو اور طالع آزما افراد سازشوں، دھوکے بازیوں، جھوٹے وعدوں، عوام کے جذبات سے کھیل کر اور اسی نوعیت کی دوسری اخلاق سوز حرکتوں کے ذریعے تختِ اقتدار پر مسلط ہو جاتے ہیں اور دیکھتے دیکھتے فخرِ ایشیا، عمرِ ثانی اور قوم کے نجات دہندہ کہلانے لگتے ہیں ۔ ان کے مصاحبین اور حکومت کے نشر و اشاعت کے وسیع ذرائع ان کی برتری اور عظمت کا اس طرح پراپیگنڈا کرتے ہیں گویا کہ ان کے علاوہ دنیا میں کوئی دوسری قابلِ احترام شخصیت موجود نہیں اور وہ صرف اپنے ملک اور قوم کے ہی قابلِ فخر نجات دہندہ نہیں بلکہ پوری نوعِ بشری کے نجات دہندہ ہیں ۔ چشمِ فلک نے آج تک ان جیسا عادل، ایثار پیشہ اور مدبر صاحبِ اقتدار کوئی دوسرا نہیں دیکھا مگر جونہی تختِ اقتدار اُن سے چھنتا ہے وہ ان صفات میں سے کسی ایک صفت کے بھی حامل نہیں رہتے بلکہ ان کے برعکس عیوب کا مجموعہ بن جاتے ہیں ۔ اس کی وجہ بجز اس کے اور کیا ہے کہ ہماری قوم کے ان افراد نے جنھیں حکمرانی کا شوق ہے انھوں نے ابھی تک اس حقیقت کو نہیں سمجھا کہ اقتدار کے ذریعے حاصل کردہ جاہ و جلال کی حیثیت ملمع سازی کی سی ہوتی ہے ۔ جب ملمع اُترتا ہے تو باقی مس خام رہ جاتا ہے جو کسی قدر کا مستحق نہیں ہوتا ۔

اقتدار کے بارے میں ہماری دوسری بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے اکثر و بیشتر حکمرانوں نے اس عظیم فرق کو ابھی تک نہیں سمجھا جو اپنی قوم کے سربراہوں اور غیر ملکی حکمرانوں کے نقطہ نظر میں پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں جو بھی مسندِ اقتدار پر آیا ہے اس نے کبھی یہ سوچنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی کہ وہ اُسی قوم کا ایک فرد ہے جس نے اُسے زمامِ کار سونپی ہے۔ اس بنا پر وہ اپنے دورِ حکمرانی میں جو اچھے بُرے کام بھی کرے گا اس کے اثرات اس کی ذات اور اس کے مستقبل پر مترتب ہوں گے۔ اگر وہ خیر اور بھلائی کے کام کرے گا، معاشرے میں عدل و انصاف کے قیام کے لیے اور ظلم اور ناانصافی کو مٹانے کے لیے وہ جو موثر قدم بھی اٹھائیگا تو اس سے اگر ایک طرف اُسے شہرت اور ناموری حاصل ہو گی تو دوسری طرف معاشرے کے ایک رکن کی حیثیت سے خود اس کی ذات اور اس کی اولاد اور اس کے خاندان اور اس کی قوم کو فائدہ پہنچے گا اور اس کے مقابلے میں وہ بُرائی کے جتنے کام کرے گا، اپنے عہدِ حکمرانی میں ظلم و استبداد کی جتنی ناپسندیدہ اور اخلاق سوز روایات چھوڑے گا ان کا عذاب اُس پر اور اس کے خاندان پر بھی مسلط ہو گا اور کسی صورت میں بھی ان سے بچ نہ سکے گا۔ خدا کی یہ سنت ہے کہ جب ایک فرد یا گروہ برائی کے ارتکاب پر مصر ہوتا ہے تو خالق نہ صرف اس کی فطرت کو مسخ کرتا ہے بلکہ اُسے بصیرت سے بھی محروم کر دیتا ہے اور وہ دور کے حالات و واقعات سے تو کیا اپنی آنکھوں کے سامنے ہونے والے حادثات سے بھی کوئی عبرت نہیں پکڑتا۔ اُس کی نگاہیں صبح و شام بلکہ ہر آن ظالموں کے انجام کو دیکھتی ہیں۔ مگر اسے جب بھی ظلم کرنے کی قوت اور موقع فراہم ہوتا ہے تو وہ فوراً اس کے نتائج سے بے پروا ہو کر اس کا ارتکاب کرنے لگتا ہے اور اس غلط فہمی میں مبتلا رہتا ہے کہ اس کا انجام دوسرے ظالموں کے انجام سے بہر طور مختلف ہو گا اور اس کی ذات ظلم کے خوفناک انجام سے ہر طرح محفوظ و مامون رہے گی۔

ہماری قوم کو حال ہی میں جو دستور ملا ہے اس میں اقتدار کے چٹورپن اور اُسے ناجائز مفادات کے حصول کا موثر ذریعہ سمجھنے کی وجہ سے جو غلط رجحانات کسی صاحبِ اقتدار کے اندر پیدا ہو سکتے ہیں اُن کی جھلک دستور میں بادنیٰ تامل دیکھی جا سکتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ الفاظ کی حد تک عوام کو چند حقوق دیے گئے ہیں مگر ان حقوق کی نوعیت بددلی سے دی ہوئی ان مراعات (UNGRUDGING CONCESSIONS) کی سی ہے جو ایک آمرِ مطلق عوام کے اصرار اور دباؤ کی وجہ سے انہیں بخش

دینے پر مجبور ہوتا ہے ورنہ دستور کی ایک ایک شق سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ سارے اختیارات کا مرکز و محور تنہا وزیر اعظم کی ذات ہے۔ اور یہ وزارتِ عظمےٰ صرف ایک شخص کے لیے مختص ہے اس بنا پر اگر اس شخص نے اپنے لامحدود اختیارات پر کوئی پابندی عائد کی ہے تو یہ اُس نے اپنی ذات پر زیادتی کرتے ہوئے قوم پر احسانِ عظیم کیا ہے، ورنہ حقیقت میں اقتدار اسی کے ہاتھ میں مرتکز رہنا چاہیئے اور کسی دوسرے فرد یا گروہ کو اس ارتکاز پر کوئی اعتراض نہ کرنا چاہیے بلکہ خدا کا شکرادا کرنا چاہیئے کہ قوم کے ایک مخلص بندے نے اختیارات کا سارا بوجھ تنہا اپنی کمر پر لاد لیا ہے اور ساری قوم کو اس مصیبت سے نجات دلائی ہے۔

اس قسم کا دستور جو صرف ایک شخص کے اختیارات کو تحفظ دینے کے لیے اور زندگی کے سارے شعبوں پر اس کی بالادستی قائم کرنے کے لیے تیار کیا گیا ہو اس کا حشر اور خود اس شخص کا حشر جس کی خوشنودی کی خاطر یہ سب دھاندلیاں کی جاتی ہیں اسی نوعیت کے آمرانہ دساتیر اور آمرانہ مزاج رکھنے والے اصحابِ اقتدار سے کسی طرح مختلف نہیں ہو سکتا۔ بھلائی ہی بھلائی کو جنم دیتی ہے اور بُرائی کے بطن سے بُرائی ہی نمودار ہوتی ہے خدا کا اپنی مخلوق پر یہ بھی ایک بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے خیر اور بھلائی کو دوام بخشا ہے۔ مگر فساد اور بُرائی کے اندر ایسے ڈائنامائٹ بچھا دیے ہیں کہ اگر باہر سے اُسے مٹانے کی کوئی صورت پیدا نہ ہو رہی ہو تو اس کے اندر سے اس کی تباہی کا سامان ہو جاتے۔ کسی انسان کا غیر مسؤل اقتدار بھی ایک ایسی بُرائی ہے جسے مٹانے کا خود قدرت نے انتظام کیا ہے کیونکہ اسی سے انسان پر انسان کی خدائی قائم ہوتی ہے رحمتِ باری آخر اس اندوھناک صورت حال کو کس طرح گوارا کر سکتی ہے کہ اُس ذریعہ کو پائیداری عطا کرے جس سے انسان پر انسان کی کبریائی قائم ہونے کا راستہ ہموار ہوتا ہے۔ چنانچہ قادرِ مطلق نے اسے تباہ کرنے کا یوں انتظام کیا ہے کہ جو شخص بھی غیر محدود اختیارات کا جس قدر حریص ہوتا ہے اُسی نسبت سے وہ ایسے ظالمانہ ہتھکنڈے استعمال کرتا ہے جس سے اس کی شہرت کو نقصان پہنچتا ہے اور عوام میں اس کی ساکھ گرنے لگتی ہے۔ اپنی اس گرتی ہوئی ساکھ کو سنبھالا دینے کے لیے وہ اپنے ارد گرد ایسے لوگ جمع کرتا ہے جو اسے یاد کراتے رہتے ہیں کہ حضور کا اقبال بڑی تیزی سے ترقی کر رہا ہے، حضور کی عزت و شہرت کا ستارہ اوجِ ثریا پر ہے، حضور کے کروڑوں پرستار حضور کی خاطر اپنی جانیں نثار کرنے کے لیے تیار کھڑے ہیں۔ بس حضور کے اشارہ ابرو چشم کے منتظر ہیں۔ اقتدار کے ایوانوں کی خواہ وہ ماضی کے ہوں یا حال کے ہمیشہ سے یہ ریت رہی ہے کہ اگر یہ حوصلہ مند مدبر

منصف مزاج اور خدا ترس لوگوں سے آباد ہوں تو پھر خوشامدیوں کو ان کے اندر راہ پانے کے کوئی زیادہ مواقع فراہم نہیں ہوتے بلکہ اِن کے اندر ان لوگوں کی پذیرائی ہوتی ہے جو حق بات کہنے کی جرأت اور حوصلہ رکھتے ہوں۔ مگر جب یہ ایوان ظالموں اور فساق و فجار سے بھر جاتے ہیں اور عوام ان کے ظلم و ستم کے خلاف دہائی دینے لگتے ہیں تو پھر یہ سفاک حکمران اپنے ضمیر کی آواز کو دبانے کے لیے قصیدہ خوانوں کی فوج بلا لیتے ہیں تاکہ وہ ان کی ثنا خوانی میں مصروف ہو جائیں۔ اس طرح بگڑے ہوئے حکمران اپنے آپ کو فریب دینے کا سامان کرتے رہتے ہیں مگر اس سے زندگی کے تلخ حقائق تو نہیں بدلتے اور نہ بگڑے ہوئے حالات کسی لحاظ سے بھی درست ہو سکتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پورے ملک میں خوفناک بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے مگر عقل کے یہ اندھے اصلاح احوال کے بجائے اپنے اقتدار کے تحفظ کی فکر کرتے ہیں اور اس مقصد کے لیے نہایت گھٹیا سے گھٹیا حربے استعمال کرتے ہیں۔ عوام کی زبانوں پر پہرے بٹھائے جاتے ہیں، ان پر مختلف طریقوں سے عرصۂ حیات تنگ کیا جاتا ہے، معاشرے کے ضمیر فروش افراد کو تلاش کر کے اُنھیں اپنے ساتھ ملایا جاتا ہے، پولیس، فوج اور نوکر شاہی کو اپنے اصل فرائض سے ہٹا کر ایک شخص کے اقتدار کو تحفظ دینے پر مامور کر دیا جاتا ہے۔ جس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ حالات مزید بگڑنے لگتے ہیں۔ صاحبِ اقتدار اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے جس قدر زیادہ ظلم کرتا ہے اسی قدر وہ عوام کی نظروں میں گرتا چلا جاتا ہے۔ اس کا مداوا وہ کوئی تعمیری قدم اٹھا کر نہیں کرتا بلکہ عوام پر دستِ ظلم دراز کر کے اور ظالموں کی تائید حاصل کر کے کرتا ہے۔

یہ بے ضمیر، خوشامدی اور ظلم و استبداد کی حمایت کرنے والے افراد صاحبِ اقتدار کی آنکھ کا تارا بن کر ناجائز مراعات حاصل کرنے کی غرض سے ہمیشہ اُسے غلط راہ پر ڈالتے رہتے ہیں۔ تاکہ وہ کوئی صحیح قدم اٹھا کر عوام کے اندر مقبولیت حاصل نہ کرے اور اس طرح ان کی تائید سے بے نیاز نہ ہو جائے۔

یہ صورت حال اقتصادی بحران کی طرح ایک شیطانی چکر ہے جس سے نکلنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ حرص اقتدار غیر مسئول اختیارات کے حصول کی خواہش پیدا کرتی ہے۔ اس خواہش کی وجہ سے انسان کے اندر دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے اور اپنے آپ کو خدا بنانے کا ناپاک جذبہ ابھرتا ہے۔ جس کی بنا پر انسان

(باقی ص ۴۸ پر)

تفہیم القرآن

النّاس

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے

کہو، میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے رب، انسانوں کے بادشاہ، انسانوں کے حقیقی معبود[۱] کی اُس وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے جو بار بار پلٹ کر آتا ہے[۲]، جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے خواہ وہ جنوں میں سے ہو یا انسانوں میں سے[۳] ع

[۱] یہاں بھی سورۂ فلق کی طرح اعوذ باللہ کہنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کو اُس کی تین صفات سے یاد کر کے اُس کی پناہ مانگنے کی تلقین کی گئی ہے۔ ایک اُس کا ربّ الناس، یعنی تمام انسانوں کا پروردگار و مربّی اور مالک و آقا ہونا۔ دوسرے اُس کا مَلِکُ النّاس، یعنی تمام انسانوں کا بادشاہ اور حاکم و فرماں روا ہونا۔ تیسرے، اُس کا اِلٰہُ النّاس، یعنی انسانوں کا حقیقی معبود ہونا۔ (یہاں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ اِلٰہ کا لفظ قرآن مجید میں دو معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایک وہ شے یا شخص جس کو عبادت کا کوئی استحقاق نہ پہنچتا ہو مگر عملاً اس کی عبادت کی جا رہی ہو۔ دوسرا وہ جسے عبادت کا استحقاق پہنچتا ہو اور جو حقیقت میں معبود ہو، خواہ لوگ اس کی عبادت کر رہے ہوں یا نہ کر رہے ہوں۔ اللہ کے لیے جہاں بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے اِسی دوسرے معنی میں ہوا ہے)۔ اِن تین صفات سے استعاذہ کا مطلب یہ ہوا کہ میں اُس خدا کی پناہ مانگتا ہوں جو انسانوں کا رب، بادشاہ، اور معبود ہونے کی حیثیت سے اُن پر کامل اقتدار رکھتا ہے جو اپنے بندوں کی حفاظت پر پوری طرح قادر ہے، اور جو واقعی اُس شر سے انسانوں کو بچا سکتا ہے جس سے خود بچنے اور دوسرے انسانوں کو بچانے کے لیے میں اُس کی پناہ مانگ رہا ہوں، یہی نہیں بلکہ چونکہ وہی رب اور بادشاہ اور اِلٰہ ہے، اس لیے اُس کے سوا اور کوئی ہے ہی نہیں جس سے میں پناہ مانگوں اور جو حقیقت میں پناہ دے بھی سکتا ہو۔

[۲] اصل میں وَسْوَاسِ الْخَنَّاس کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ وَسواس کے معنی ہیں بار بار وسوسہ ڈالنے والا۔ اور وَسوسے کے معنی ہیں پے در پے ایسے طریقے یا طریقوں سے کسی کے دل میں کوئی بری بات ڈالنا کہ جس کے دل میں وہ ڈالی جا رہی ہو اُسے یہ محسوس نہ ہو سکے کہ وسوسہ انداز اس کے دل میں ایک بری بات ڈال رہا ہے۔ وَسوسے کے لفظ

میں خود تکرار کا مفہوم شامل ہے، جیسے زلزلہ میں حرکت کی تکرار کا مفہوم شامل ہے۔ چونکہ انسان صرف ایک دفعہ بہکانے سے نہیں بہکتا بلکہ اسے بہکانے کی پے در پے کوشش کرنی ہوتی ہے، اس لیے ایسی کوشش کو وَسْوَسہ اور کوشش کرنے والے کو وَسْوَاس کہا جاتا ہے۔ رہا لفظ خنّاس، تو یہ خُنوس سے ہے جس کے معنی ظاہر ہونے کے بعد چھپنے یا آنے کے بعد پیچھے ہٹ جانے کے ہیں، اور خنّاس چونکہ مبالغہ کا صیغہ ہے اس لیے اس کے معنی یہ فعل بکثرت کرنے والے کے ہوئے۔ اب یہ ظاہر بات ہے کہ وسوسہ ڈالنے والے کو بار بار وسوسہ اندازی کے لیے آدمی کے پاس آنا پڑتا ہے، اور ساتھ ساتھ جب اسے خنّاس بھی کہا گیا تو دونوں الفاظ کے ملنے سے خود بخود یہ مفہوم پیدا ہو گیا کہ وسوسہ ڈال کر وہ پیچھے ہٹ جاتا ہے اور پھر پے در پے وسوسہ اندازی کے لیے پلٹ کر آتا ہے۔ بالفاظ دیگر ایک مرتبہ اس کی وسوسہ اندازی کی کوشش جب ناکام ہوتی ہے تو وہ چلا جاتا ہے، پھر وہی کوشش کرنے کے لیے دوبارہ، سہ بارہ، اور بار بار آتا رہتا ہے۔

وسواس الخناس کا مطلب سمجھ لینے کے بعد اب اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ اس کے شر سے پناہ مانگنے کا مطلب کیا ہے؟ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ پناہ مانگنے والا خود اُس کے شر سے خدا کی پناہ مانگتا ہے، یعنی اِس شر سے کہ وہ کہیں اُس کے اپنے دل میں کوئی وسوسہ نہ ڈال دے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے راستے کی طرف دعوت دینے والے کے خلاف جو شخص بھی لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا پھرے اُس کے شر سے داعیِ حق خدا کی پناہ مانگتا ہے۔ داعی الی الحق کے بس کا یہ کام نہیں ہے کہ اُس کی ذات کے خلاف اور اُس کی دعوت کے خلاف جن جن لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالے جا رہے ہوں ان سب تک خود پہنچے اور ایک ایک شخص کی غلط فہمیوں کو صاف کرے۔ اُس کے لیے یہ بھی مناسب نہیں ہے کہ اپنی دعوت الی اللہ کا کام چھوڑ چھاڑ کر وسوسہ اندازوں کی پیدا کردہ غلط فہمیوں کو صاف کرنے اور اُن کے الزامات کی جواب دہی کرنے میں لگ جائے۔ اُس کے مقام سے یہ بات بھی فروتر ہے کہ جس سطح پر اس کے مخالفین اُترے ہوئے ہیں اسی پر خود بھی اتر آئے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے دعوتِ حق دینے والے کو ہدایت فرمائی کہ ایسے اَشرار کے شر سے بس خدا کی پناہ مانگ لے اور پھر بے فکری کے ساتھ اپنی دعوت کے کام میں لگا رہے۔ اِس کے بعد اُن سے نمٹنا تیرا کام نہیں بلکہ رب الناس، ملک الناس اور اِلٰہ الناس کا کام ہے۔

اس مقام پر یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ وسوسہ عملِ شر کا نقطۂ آغاز ہے۔ وہ جب ایک غافل یا خالی الذہن آدمی کے اندر اثر انداز ہو جاتا ہے تو پہلے اُس میں برائی کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ پھر مزید وسوسہ اندازی اُس بری خواہش کو بری نیت اور برے ارادے میں تبدیل کر دیتی ہے۔ پھر اس سے آگے جب وسوسے کی تاثیر بڑھتی ہے تو ارادہ

عزم بن جاتا ہے اور آخری قدم پھر عمل شر ہے۔ اس لیے وسوسہ انداز کے شر سے خدا کی پناہ مانگنے کا مطلب یہ ہے کہ شر کا آغاز جس مقام سے ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اُسی مقام پر اس کا قلع قمع فرما دے۔

دوسرے لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو وسوسہ اندازوں کے شر کی ترتیب یہ نظر آتی ہے کہ پہلے وہ کھلے کفر، شرک، دہریت، یا اللہ اور رسول سے بغاوت اور اللہ والوں کی عداوت پر اُکساتے ہیں۔ اس میں ناکامی ہو اور آدمی دینِ اللہ میں داخل ہی ہو جائے تو وہ اسے کسی نہ کسی بدعت کی راہ سُجھاتے ہیں۔ یہ بھی نہ ہو سکے تو معصیت کی رغبت دلاتے ہیں۔ اس میں بھی کامیابی نہ ہو سکے تو آدمی کے دل میں یہ خیال ڈالتے ہیں کہ چھوٹے چھوٹے گناہ کر لینے میں تو کوئی حرج نہیں تاکہ یہی اگر کثرت سے صادر ہو جائیں تو گناہوں کا بارِ عظیم انسان پر لد جائے۔ اِس سے بھی اگر آدمی بچ نکلے تو بدرجۂ آخر وہ کوشش کرتے ہیں کہ آدمی دینِ حق کو بس اپنے آپ تک ہی محدود رکھے، اُسے غالب کرنے کی فکر نہ کرے۔ لیکن اگر کوئی شخص ان تمام چالوں کو ناکام کر دے تو پھر شیاطینِ جن وانس کی پوری پارٹی ایسے آدمی پر پل پڑتی ہے، اس کے خلاف لوگوں کو اکساتی اور بھڑکاتی ہے، اُس پر گالیوں اور الزامات کی بوچھاڑ کراتی ہے، اسے ہر طرف بدنام اور رسوا کرنے کی کوشش کرتی ہے، پھر شیطان اُس مردِ مومن کو آکر غصہ دلاتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ سب کچھ برداشت کر لینا تو بڑی بزدلی کی بات ہے، اُٹھ اور اِن حملہ آوروں سے بھڑ جا۔ یہ شیطان کا آخری حربہ ہے جس سے وہ دعوتِ حق کی راہ کھوٹی کرانے اور داعیِ حق کو راہ کے کانٹوں سے الجھا دینے کی کوشش کرتا ہے۔ اِس سے بھی اگر داعیِ حق بچ نکلے تو شیطان اس کے آگے بے بس ہو جاتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کے متعلق قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ، "اور اگر شیطان کی طرف سے تمہیں کوئی اُکساہٹ محسوس ہو تو اللہ کی پناہ مانگو" (الاعراف ۲۰۰۔ حٰم السجدہ ۳۶)۔ وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُبِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ "کہو میرے پروردگار میں شیاطین کی اُکساہٹوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں" (المومنون ۹۷)۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ، "جو لوگ پرہیزگار ہیں اُن کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ کبھی شیطان کے اثر سے کوئی برا خیال اُنہیں چھو بھی جائے تو وہ فوراً چونک جاتے ہیں اور پھر انہیں (صحیح راستہ) صاف نظر آنے لگتا ہے" (الاعراف ۲۰۱)۔ اور اسی بنا پر جو لوگ شیطان کے اِس آخری حربے سے بچ نکلیں ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْحَظٍّ عَظِيْمٍ، "یہ چیز بڑے نصیبے والے کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہوتی" (حٰم السجدہ ۳۵)۔

اس سلسلے میں ایک بات اور بھی نگاہ میں رہنی چاہیے۔ وہ یہ کہ انسان کے دل میں وسوسہ اندازی صرف باہر سے شیاطین جن و انس ہی نہیں کرتے بلکہ اندر سے خود انسان کا اپنا نفس بھی کرتا ہے۔ اُس کے اپنے غلط نظریات اُس کی عقل کو گمراہ کرتے ہیں۔ اُس کی اپنی ناجائز اغراض و خواہشات اُس کی قوتِ تمیز اور قوتِ ارادی اور قوتِ فیصلہ کو بدراہ کرتی ہیں۔ اور باہر کے شیاطین ہی نہیں، انسان کے اندر اس کے اپنے نفس کا شیطان بھی اُس کو بہکاتا ہے۔ یہی بات ہے جو قرآن میں ایک جگہ فرمائی گئی ہے کہ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ (قٓ-۱۶) "اور ہم اُس کے اپنے نفس سے ابھرنے والے وسوسوں کو جانتے ہیں"۔ اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مشہور خطبہ مسنونہ میں فرمایا ہے نعوذ باللہ من شرور انفسنا "ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں اپنے نفس کی شرارتوں سے"۔

۵۳ بعض اہل علم کے نزدیک اِن الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ وسوسہ ڈالنے والا دو قسم کے لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے، ایک جن، دوسرے انسان۔ اس بات کو اگر تسلیم کیا جائے تو لفظ ناس کا اطلاق جن اور انسان دونوں پر ہوگا۔ وہ کہتے ہیں کہ ایسا ہو سکتا ہے، کیونکہ قرآن میں جب رِجَالٌ (مردوں) کا لفظ جنوں کے لیے استعمال ہوا ہے، جیساکہ سورۂ جن آیت ۶ میں ہم دیکھتے ہیں، اور جب نَفَر کا استعمال جنوں کے گروہ پر ہو سکتا ہے، جیساکہ سورۂ احقاف آیت ۲۹ میں ہوا ہے، تو مجازاً ناس کے لفظ میں بھی انسان اور جن دونوں شامل ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ رائے اس لیے غلط ہے کہ ناس اور اِنس اور انسان کے الفاظ لغت ہی کے اعتبار سے لفظ جن کی ضد ہیں۔ جن کے اصل معنی پوشیدہ مخلوق کے ہیں اور جن کو جن اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ وہ انسانی آنکھ سے مخفی ہے۔ اس کے برعکس ناس اور اِنس کے الفاظ انسان کے لیے بولے ہی اس بنا پر جاتے ہیں کہ وہ ظاہر اور مرئی اور محسوس ہے۔ سورۂ قصص، آیت ۲۹ میں ہے آنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا۔ یہاں آنَسَ کے معنی رَاٰی ہیں، یعنی حضرت موسیٰؑ نے "کوہ طور کے کنارے آگ دیکھی"۔ سورۂ نساء، آیت ۶ میں ہے فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا "اگر تم محسوس کرو کہ یتیم بچے اب ہوشمند ہو گئے ہیں"۔ یہاں اٰنَسْتُمْ کے معنی اَحْسَسْتُمْ یا رَاَیْتُمْ ہیں۔ پس ناس کا اطلاق لغت عرب کی رو سے جنوں پر نہیں ہو سکتا، اور آیت کے صحیح معنی یہ ہیں کہ "اُس وسوسہ انداز کے شر سے جو انسانوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے، خواہ وہ جنوں میں سے ہو یا خود انسانوں میں سے"۔ یعنی دوسرے الفاظ میں وسوسہ اندازی کا کام شیاطینِ جن بھی کرتے ہیں اور شیاطینِ اِنس بھی، اور دونوں کے شر سے پناہ مانگنے کی اس سورہ میں تلقین کی گئی ہے۔ اس معنی کی تائید قرآن سے بھی ہوتی ہے اور حدیث سے بھی۔ قرآن میں فرمایا:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ۔ (الانعام - ۱۱۲)

اور اِسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے شیطان جنوں اور شیطان انسانوں کو دشمن بنا دیا ہے جو ایک دوسرے پر خوش آیند باتیں دھوکے اور فریب کے طور پر القا کرتے ہیں۔

اور حدیث میں امام احمد، نسائی اور ابن حبان حضرت ابوذرؓ کی روایت نقل کرتے ہیں کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ مسجد میں تشریف فرما تھے۔ فرمایا ابوذر، تم نے نماز پڑھی؟ میں نے عرض کیا نہیں۔ فرمایا اٹھو اور نماز پڑھو۔ چنانچہ میں نے نماز پڑھی اور پھر آکر بیٹھ گیا۔ حضورؐ نے فرمایا یا اباذر، تَعَوَّذْ بِاللہ من شر شیاطینِ الانس والجن، "اے ابوذر، شیاطینِ انس اور شیاطینِ جن کے شر سے اللہ کی پناہ مانگو"۔ میں نے عرض کیا یارسول اللہ، کیا انسانوں میں بھی شیطان ہوتے ہیں؟ فرمایا ہاں۔

خاتمہ

میں صمیم قلب سے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ تفہیم القرآن لکھنے کا جو کٹھن کام میں نے محرم ۱۳۶۱ھ (فروری ۱۹۴۲ء) میں شروع کیا تھا وہ ۳۰ سال چار مہینے بعد آج پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ یہ سراسر اللہ کا فضل و احسان ہے کہ اس نے اپنے ایک حقیر بندے کو اپنی کتاب پاک کی یہ خدمت انجام دینے کی توفیق عطا فرمائی۔ اِس میں جو کچھ صحیح و برحق ہے وہ اللہ کی ہدایت و رہنمائی کی بدولت ہے، اور جہاں کہیں میں نے قرآن کی ترجمانی و تفسیر میں غلطی کی ہے وہ میرے اپنے علم و فہم کا قصور ہے لیکن الحمد للہ کہ میں نے کوئی غلطی جان بوجھ کر نہیں کی ہے اس لیے میں اللہ کے کرم سے امید رکھتا ہوں کہ وہ اسے معاف فرما دے گا، اور میرے اِس کام کے ذریعہ سے اگر اس کے بندوں کو ہدایت پانے میں کوئی مدد ملی ہے تو اس کو میری مغفرت کا ذریعہ بنا دے گا۔ اصحاب علم سے بھی میری درخواست ہے کہ وہ میری غلطیوں پر مجھے متنبہ فرمائیں۔ جس بات کا بھی غلط ہونا دلیل سے مجھ پر واضح کر دیا جائے گا، اِن شاء اللہ اس کی اصلاح کر دوں گا۔ میں اس بات سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں کہ کتاب اللہ کے معاملہ میں دانستہ غلطی کروں، یا کسی غلطی پر جما رہوں۔

جیسا کہ اس کتاب کے نام سے ظاہر ہے، اس میں میری کوشش یہ رہی ہے کہ عام پڑھے لکھے لوگوں کو قرآن اُس طرح سمجھاؤں جس طرح میں نے خود اسے سمجھا ہے، اُس کے اصل مفہوم و مدعا کو اس طرح کھول کر بیان کر دوں کہ لوگ قرآن کی روح تک پہنچ سکیں، اُن تمام شکوک و شبہات کو رفع کر دوں اور اُن سوالات کے جواب دے دوں جو قرآن کو، یا اس کے محض ترجموں کو پڑھ کر دلوں میں پیدا ہوتے ہیں، اور اُن چیزوں کی وضاحت کر دوں جنہیں قرآن مجید میں ایجاز و اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ابتدا میں میرے پیش نظر زیادہ تفصیل سے کام لینا نہ تھا اس لیے پہلی جلد کے حواشی مختصر ہے۔ بعد میں جوں جوں میں آگے بڑھتا گیا، مجھے حواشی میں زیادہ تفصیل کی ضرورت محسوس ہوتی گئی، یہاں تک کہ بعد کی جلدوں کو دیکھنے والے اب پہلی جلد کو تشنہ محسوس کرنے لگے ہیں۔ لیکن قرآن مجید میں مضامین کی تکرار کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ جس مضمون کی تشریح ایک جگہ تشنہ رہ گئی ہو وہ چونکہ بعد کی سورتوں میں بھی آیا ہے اس لیے اُن کی پوری تشریح بعد کی سورتوں کے حواشی میں ہو جاتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ جو لوگ قرآن مجید کو تفہیم القرآن کی مدد سے صرف ایک دفعہ پڑھنے پر اکتفا نہ کریں گے وہ پوری کتاب کو دوبارہ پڑھتے وقت خود محسوس کریں گے کہ بعد کی سورتوں کی تشریحات ابتدائی سورتوں کے سمجھنے میں کافی مددگار ثابت ہوتی ہیں۔

لاہور

۲۴ ربیع الثانی ۱۳۹۲ھ

(۷ جون ۱۹۷۲ء)

ابو الاعلیٰ

ضمیمہ ۱

بسلسلۂ الدھر، حاشیہ ۳۳

ان آیات میں تین باتیں ارشاد ہوئی ہیں۔ ایک یہ کہ جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف جانے کا راستہ اختیار کرے۔ دوسرے یہ کہ تمہارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا جب تک اللہ نہ چاہے۔ تیسرے یہ کہ اللہ بڑا حکیم و علیم ہے۔ ان تینوں باتوں پر اگر اچھی طرح غور کیا جائے تو انسان کی آزادیِ اختیار اور اللہ کی مشیت کا تعلق بخوبی سمجھ میں آجاتا ہے اور وہ تمام الجھنیں صاف ہو جاتی ہیں جو تقدیر کے مسئلے میں بالعموم لوگوں کے ذہنوں میں پائی جاتی ہیں۔

پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا میں انسان کو جو اختیارات دیے گئے ہیں وہ صرف اِس حد تک ہیں کہ یہاں زندگی بسر کرنے کے لیے جو مختلف راستے اُس کے سامنے آتے ہیں اُن میں سے کسی کو اختیار کرنے کا فیصلہ کرے۔ یہ انتخاب کی آزادی (FREEDOM OF CHOICE) ہے جو اللہ نے اُس کو دی ہے۔ مثلاً ایک آدمی کے سامنے اپنی روزی حاصل کرنے کا سوال جب آتا ہے تو اُس کے آگے بہت سے راستے ہوتے ہیں جن میں سے کچھ حلال ہیں، جیسے جائز نوعیت کی محنت مزدوری، ملازمت، تجارت، یا صنعت و حرفت یا زراعت۔ اور کچھ حرام ہیں، مثلاً چوری، ڈاکہ، رہزنی، جیب تراشی، عصمت فروشی، سود خواری، قمار بازی، رشوت اور حرام نوعیت کی نوکریاں اور تجارتیں وغیرہ۔ ان میں سے کسی ایک راستے کو اختیار کرنے کا فیصلہ انسان کے اپنے انتخاب پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ اپنا رزق کس طریقے سے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اِسی طرح اخلاق کے مختلف ڈھنگ ہیں۔ ایک طرف دیانت، امانت، شرافت، شائستگی، انصاف، رحم، ہمدردی، اور عصمت و عفت جیسے خصائل ہیں، اور دوسری طرف بد معاشی، کمینگی، ظلم و ستم، بے ایمانی، آوارگی اور بیہودگی و بدتمیزی جیسے رذائل۔ اُس کو پوری آزادی ہے کہ ان میں سے جس ڈھنگ کے اخلاق اختیار کرنا چاہے کرے۔ ایسا ہی معاملہ دین و مذہب کا ہے کہ اُس میں بھی بہت سے راستے انسان کے سامنے کھلے ہوئے ہیں۔ الحاد اور انکارِ خدا، شرک و بت پرستی، شرک و توحید کے مختلف مخلوطے، اور ایک وہ خالص خدا پرستی جس کی تعلیم قرآن دیتا ہے۔ ان میں بھی یہ فیصلہ کرنا انسان ہی پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ ان میں سے کس کو اختیار کرنا چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُس پر جبراً اپنا کوئی فیصلہ نہیں

ٹھونستا کہ وہ چاہتا تو ہو حلال روزی اور اللہ زبردستی اسے حرام خور بنا ئے، یا وہ چاہتا تو ہو قرآن کی پیروی اور سالتہ جبراً اسے ملحد یا مشرک یا کافر بنا دے، یا وہ چاہتا تو ہو نیک انسان بننا اور اللہ اسے خواہ مخواہ بد بنا دے۔

لیکن اس آزادیِ انتخاب کے بعد یہ بات کہ انسان عملاً بھی وہی کچھ کر سکے جو وہ کرنا چاہتا ہے، اللہ کی مشیت اور اس کے اذن اور اس کی توفیق پر منحصر ہے۔ اگر اللہ کی مشیت یہ ہو کہ انسان کو وہ کام کرنے دے جس کے کرنے کی خواہش یا ارادہ یا فیصلہ اس نے کیا ہے تب ہی وہ اُس کو کر سکتا ہے، ورنہ وہ چاہے کتنی ہی کوشش کرے اللہ کے اذن اور اس کی مشیت کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔ یہی بات دوسری آیت میں فرمائی گئی ہے۔ اِس معاملہ کو یوں سمجھیے کہ اگر دنیا میں انسان کو سارے اختیارات تفویض کر دیے گئے ہوتے اور یہ بات اس کی مرضی پر چھوڑ دی گئی ہوتی کہ وہ جو کچھ بھی کرنا چاہے کر گزرے تو نظام عالم درہم برہم ہو جاتا۔ ایک قاتل تمام دنیا کے انسانوں کو قتل کر دینے کے لیے کافی تھا اگر اسے یہ چھوٹ مل جاتی کہ جسے چاہے قتل کر دے۔ ایک جیب کترا دنیا کے کسی آدمی کی جیب سلامت نہ چھوڑتا اگر اس کو یہ اختیار دے دیا جاتا کہ جس کی جیب کترنا چاہے کتر ڈالے۔ ایک چور کے ہاتھ سے کسی کا مال نہ بچتا، ایک زانی سے کوئی عورت نہ بچتی، ایک ڈاکو سے کسی کا گھر نہ بچ سکتا اگر ان میں سے ہر ایک کو من مانی کرنے کے پورے اختیارات حاصل ہوتے۔ اس لیے یہ بات اللہ نے اپنے ہی ہاتھ میں رکھی ہے کہ انسان صحیح یا غلط، جس راستے پر بھی چلنا چاہے اُس پر اُسے چلنے دے یا نہ چلنے دے۔ جو شخص گمراہی کو چھوڑ کر راہِ راست اختیار کرنا چاہے اس کو بھی عملاً راست روی اللہ ہی کی مشیت اور اسی کی توفیق سے نصیب ہو سکتی ہے۔ البتہ شرط یہ ہے کہ ضلالت کو چھوڑ کر ہدایت کو انتخاب کرنے کا فیصلہ انسان نے خود کیا ہو، ورنہ جس طرح اللہ کسی کو زبردستی چور یا قاتل یا ملحد یا مشرک نہیں بناتا اسی طرح وہ اس کو زبردستی مومن بھی نہیں بناتا۔

اس کے بعد تیسری آیت اس غلط فہمی کو رفع کرتی ہے کہ اللہ کی یہ مشیت کہیں اَلل ٹپ (ARBITRARY) تو نہیں ہے۔ اس کو رفع کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ علیم اور حکیم ہے، یعنی وہ دانا ہے اور سب کچھ جانتا ہے، جو کچھ بھی کرتا ہے علم اور دانائی کے ساتھ کرتا ہے، اس لیے اس کے فیصلے میں غلطی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ وہ پورے علم اور پوری حکمت کے ساتھ یہ طے کرتا ہے کہ کس کو کیا توفیق دینی چاہیے اور کیا نہ دینی چاہیے، کسے کیا کام کرنے دینا چاہیے اور کیا نہ کرنے دینا چاہیے۔ جس حد تک وہ انسان کو موقع دیتا ہے اور اسباب کو

اُس کے لیے سازگار بناتا ہے اُسی حد تک وہ اپنی خواہش کے مطابق کام کر سکتا ہے خواہ وہ اچھا کام ہو یا برا کام۔ ہدایت کا معاملہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی اپنے علم کی بنا پر یہ جانتا ہے اور وہی اپنی حکمت کی بنا پر یہ طے کرتا ہے کہ کون ہدایت کا مستحق ہے اور کون نہیں ہے۔

ضمیمہ ۲

بسلسلۂ الدھر، حاشیہ ۳۴

اس آیت میں ظالم سے مراد وہ لوگ ہیں جن تک اللہ کا کلام اور اس کے نبی کی تعلیم پہنچے اور پھر وہ خوب سوچ سمجھ کر، جان بوجھ کر، یہ فیصلہ کریں کہ ہمیں اس کی پیروی نہیں کرنی ہے۔ اِن میں وہ ظالم بھی شامل ہیں جو صاف صاف کہہ دیں کہ ہم اِس کلام کو خدا کا کلام اور اِس نبی کو خدا کا نبی نہیں مانتے، یا سرے سے خدا ہی کو نہیں مانتے۔ اور وہ ظالم بھی شامل ہیں جو خدا اور نبی اور قرآن کو ماننے سے انکار تو نہیں کرتے مگر فیصلہ اُن کا یہی ہوتا ہے کہ ہمیں اُس کی پیروی نہیں کرنی ہے۔ حقیقت کے اعتبار سے یہ دونوں ہی گروہ ظالم ہیں۔ پہلے گروہ کا معاملہ تو صاف ہی ہے۔ لیکن دوسرا گروہ بھی اس سے کچھ کم ظالم نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ وہ منافق اور دغاباز بھی ہے۔ زبان سے کہتا ہے کہ ہم خدا کو مانتے ہیں، رسول کو مانتے ہیں، قرآن کو مانتے ہیں، مگر ان کے دل اور دماغ کا فیصلہ یہی ہوتا ہے کہ اس کا اتباع انہیں نہیں کرنا ہے، اور عمل بھی وہ اس کے خلاف ہی کرتے ہیں۔ ان دونوں قسم کے لوگوں کے متعلق اللہ تعالیٰ کا اعلان یہ ہے کہ ہم نے اُن کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ دنیا میں چاہے وہ دندناتے پھریں۔ خوب دادِ عیش دیں۔ اپنی بڑائی کے ڈنکے خوب بجا لیں۔ مگر آخرکار اُن کا انجام ایک دردناک عذاب کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اللہ کی رحمت میں داخل ہونا ان کو نصیب نہیں ہو سکتا۔

ضمیمہ ۳

بسلسلہ المرسلات، حاشیہ ۱

ان آیات میں ابتداءً بارش لانے والی ہواؤں کی ترتیب یہ بیان کی گئی ہے کہ پہلے پے در پے ہوائیں چلنی شروع ہوتی ہیں، پھر آندھی کی شکل اختیار کر لیتی ہیں، پھر بادلوں کو اٹھا کر پھیلاتی ہیں، پھر انہیں پھاڑ کر جدا کرتی ہیں۔ اس کے بعد بارش کے نزول کا ذکر کرنے کے بجائے یہ فرمایا گیا ہے کہ وہ اللہ کی یاد دلوں میں ڈالتی ہیں عذر کے طور پر یا ڈراوے کے طور پر، یعنی وہ ایسا موقع ہوتا ہے کہ آدمی کے دل میں یا تو خوف پیدا ہوتا ہے اور اس بنا پر وہ اللہ کو یاد کرنے پر مجبور ہوتا ہے، یا پھر آدمی اپنے قصوروں کا اعتراف کر کے دعا کرتا ہے کہ اللہ اسے تباہی سے بچائے اور اس پر رحم کر کے بارانِ رحمت سے اس کو نواز دے۔ اگر ایک مدت تک بارش نہ ہوئی ہو اور لوگ پانی کے قطرے قطرے کو ترس رہے ہوں تو اس موقع پر آندھیوں کو چلتے اور بادلوں کو آتے دیکھ کر بعض اوقات کٹے سے کٹا کافر بھی خدا کو یاد کرنے لگتا ہے۔ فرق اگر کچھ پڑتا ہے تو صرف اس سے کہ قحط ہلکا ہے یا سخت۔ معمولی قحط ہو تو عام آدمی جو اللہ تعالیٰ سے زیادہ دور نہیں ہے وہ اُس کو یاد کرے گا، لیکن دوسرے لوگ سائنس بگھاریں گے اور کہیں گے کہ کوئی گھبرانے کی بات نہیں، فلاں فلاں اسباب سے بارش نہیں ہو رہی ہے، اتنی سی بات پر دعائیں مانگنے لگنا ضعیف الاعتقادی ہے۔ البتہ اگر طویل مدت تک قحط برپا رہے اور پورا ملک تباہی سے دوچار ہو جائے تو بڑے بڑے کافروں کو خدا یاد آنے لگتا ہے، زبان سے کہتے ہوئے شرم بھی آتی ہو تو دل میں وہ اپنی گناہ گاریوں اور ناشکریوں پر ندامت محسوس کرتے ہیں اور خدا سے دعا مانگتے ہیں کہ جو ہوائیں بادل اٹھا کر لا رہی ہیں ان سے پورے ملک میں بارش ہو جائے۔ یہ ہے عذر کے طور پر دلوں میں خدا کی یاد کا القاء۔ رہا نُذر (ڈراوے) کے طور پر اُس کا اِلقاء، تو یہ اُس وقت ہوتا ہے جب آندھی بڑھتے بڑھتے طوفانِ عظیم بن جائے اور بستیوں کی بستیاں تباہ کرتی چلی جائے، یا بارش اس قدر زوردار ہو کہ سیلاب بلا بن جائے۔ ایسی حالت میں مضبوط سے مضبوط دل کا منکر بھی خوف کے مارے خدا کے آگے گڑگڑانے لگتا ہے اور اُس وقت طوفان یا سیلاب کی ساری سائنٹفک توجیہات اُس کے نہاں خانۂ دماغ سے فرار کر جاتی ہیں۔ پس ہواؤں کے چلنے کی اس ترتیب کو بیان کرنے کے

بعد یہ کہنا کہ یہ ہوائیں عُذر کے طور پر یا ڈراوے کے طور پر اللہ کی یاد دلوں میں ڈالتی ہیں، گویا دوسرے الفاظ میں یہ کہنا ہے کہ یہ سارا نظام جو دنیا میں چل رہا ہے انسان کو اِس حقیقت سے خبردار کرتا رہتا ہے کہ اِس زمین پر سب کچھ اُسی کے اختیار میں نہیں دے دیا گیا ہے بلکہ اوپر کوئی بالاتر طاقت موجود ہے جو اُس کی قسمت پر حکمرانی کر رہی ہے۔ اُس کا اقتدار اتنا زبردست ہے کہ جب چاہے وہ عناصر کو انسان کی پرورش کے لیے استعمال کر سکتی ہے اور جب چاہے انہی عناصر سے اس کی تباہی کا کام لے سکتی ہے۔

اس کے بعد ہواؤں کے اِسی نظام کو اِس بات کی دلیل قرار دیا گیا ہے کہ وہ قیامت جس کے برپا ہونے کا وعدہ تم سے کیا جا رہا ہے، ضرور واقع ہونے والی ہے۔ اب دیکھنا چاہیے کہ یہ نظام اِس پر کیسے گواہی دے رہا ہے۔

انسان بالعموم قیامت اور آخرت کے معاملہ میں دو سوالات پر اُلجھتا ہے۔ ایک یہ کہ ایسا ہونا ممکن بھی ہے یا نہیں؟ دوسرے یہ کہ اس کی ضرورت کیا ہے؟ اور پھر انہی سوالات میں الجھتے ہوئے اسے یہ شک لاحق ہو جاتا ہے کہ وہ آئے گی بھی یا نہیں، یا یہ محض ایک افسانہ ہے؟ اِس پر قرآن میں جگہ جگہ کائنات کے نظام سے استدلال کرتے ہوئے اُس کا امکان، اس کا وجوب اور اُس کا وقوع ثابت کیا گیا ہے، اور کہیں یہ استدلال اِس طرز پر کیا گیا ہے کہ خدا کی خدائی کے بے شمار آثار میں سے بعض کی قسم کھا کر فرمایا گیا ہے کہ وہ آنے والی ہے۔ اِس طریقِ استدلال میں اس کے امکان کے دلائل بھی آجاتے ہیں، وجوب کے دلائل بھی اور وقوع کے دلائل بھی۔

یہاں استدلال کا یہی طریقہ اختیار کرتے ہوئے صرف ہواؤں کی گردش اور بارشوں کی آمد کے نظام کو اس امر کی علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے کہ یہ ایک باقاعدہ نظام ہے جو کسی حکیم اور قادرِ مطلق کی تدبیر سے قائم ہوا ہے، کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے جس سے زمین کی فضا میں خود بخود یہ طریقہ چل پڑا ہو کہ یوں سمندروں سے بھاپیں اٹھیں، یوں ہوائیں ان کو لے کر چلیں، یوں وہ ان کو سمیٹ کر بادل بنائیں، پھر یوں وہ ان کو مختلف ٹکڑیوں میں تقسیم کر کے زمین کے مختلف حصوں پر پہنچائیں، اور یوں ان سے جگہ جگہ بارش ہو۔ یہ نظام ایک اندھی بہری فطرت نے کسی اندھیر نگری میں اتفاقاً نہیں بنا دیا ہے، بلکہ یہ ایک سوچا سمجھا اور جچا تُلا منصوبہ ہے جو پوری باقاعدگی کے ساتھ ایک قانون کے مطابق چل رہا ہے۔ اسی لیے کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ سمندر پر سورج کی گرمی پہنچنے سے بھاپیں اٹھنے کے بجائے برف جم جائے بلکہ ہمیشہ دھوپ کی حرارت سے بھاپیں ہی اٹھتی ہیں۔

کبھی موسمی ہوائیں الٹی چال نہیں چلتیں کہ بھاپوں کو اٹھانے کے بجائے سمندر ہی میں دبا دیں بلکہ وہ ہمیشہ ان کو اوپر ہی اٹھاتی ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ بادلوں کا بننا بند ہو جائے، ہوائیں ان کو لے کر خشک علاقوں کی طرف چلنا چھوڑ بیٹھیں، اور خشکی پر بارشوں کے نزول کا سلسلہ رُک کر رہ جائے۔ کروڑوں سال سے ایک ہی قاعدہ ہے جس پر یہ نظام مسلسل چل رہا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس زمین پر آپ کا وجود میں آنا اور جینا ممکن نہ ہوتا۔

اس نظام میں آپ ایک کھلی ہوئی مقصدیت اور ایک باضابطہ قانون کی کارفرمائی پاتے ہیں۔ آپ کو علانیہ نظر آرہا ہے کہ زمین پر انسان، حیوان اور نباتات کی زندگی کا نہایت گہرا تعلق ان ہواؤں اور ان بارشوں سے ہے، اور یہ انتظام اس امر کی کھلی گواہی دے رہا ہے کہ پانی کی یہ فراہمی ذی حیات مخلوق کو وجود میں لانے اور زندہ رکھنے کے لیے ٹھیک ٹھیک اُس کی ضروریات کے مطابق اور ایک قانون کے مطابق کی گئی ہے۔ یہ مقصدیت اور باقاعدگی صرف اِسی ایک معاملہ میں نہیں بلکہ کائنات کے پورے نظام میں پائی جاتی ہے اور انسان کی ساری سائنٹفک ترقی اِسی پر مبنی ہے۔ ایک ایک چیز کے متعلق آپ یہ معلوم کرتے ہیں کہ وہ کس غرض کے لیے ہے اور کس قاعدے پر کام کرتی ہے، پھر جن جن چیزوں کے بارے میں جتنا جتنا آپ کو یہ معلوم ہوتا جاتا ہے کہ ان کا مقصد کیا ہے اور ان میں کام کرنے والے قوانین کیا ہیں اسی قدر آپ ان کے استعمال کے نئے نئے طریقے نکالتے چلے جاتے ہیں اور نئی نئی ایجادیں کر کے اپنے تمدن کو ترقی دیتے چلے جاتے ہیں۔ آپ کے ذہن میں اگر فطری طور پر یہ تصور موجود نہ ہوتا کہ یہ دنیا ایک بامقصد دنیا ہے اور اس کے اندر ہر چیز ایک قانون پر کام کر رہی ہے تو آپ کے دماغ میں سرے سے کسی چیز کے متعلق یہ سوال ہی پیدا نہ ہوتا کہ یہ کس غرض کے لیے ہے اور اس سے کس طرح کام لیا جا سکتا ہے۔

اب اگر یہ دنیا اور اس کی ایک ایک چیز بامقصد ہے، اور اگر اس دنیا اور اس کی ہر چیز میں ایک قانون کارفرما ہے، اور اگر یہ اربوں سال سے پیہم اِسی مقصدیت اور باضابطگی کے ساتھ چل رہی ہے، تو صرف ایک ضدی انسان ہی یہ ماننے سے انکار کر سکتا ہے کہ ایک علیم و حکیم اور قادرِ مطلق خدا نے اِسے بنایا ہے، اور اُس خدا کے متعلق یہ خیال کرنا سراسر ایک احمقانہ بات ہے کہ وہ اسے بنا اور چلا تو سکتا ہے مگر توڑ نہیں سکتا اور توڑ کر پھر کسی اور شکل میں بنانا چاہے تو نہیں بنا سکتا۔ مادے کے متعلق یہ تصور کہ وہ غیر فانی ہے قدیم زمانے کے جاہل دہریوں کا بہت بڑا سہارا تھا، مگر علم کی ترقی نے اسے بھی باطل ثابت کر دیا ہے۔ اب یہ حقیقت علمی مسلّمات میں سے ہے کہ مادہ

قوت (ENERGY) میں تبدیل ہو سکتا ہے اور قوت مادے کی شکل اختیار کر سکتی ہے۔ اس لیے یہ بات سراسر علم اور عقل کے مطابق ہے کہ خدائے حیّ و قیوم جب تک اِس مادی دنیا کو قائم رکھے ہوئے ہے اسی وقت تک یہ قائم ہے۔ جونہی وہ اِسے قوت میں تبدیل کرنا چاہے صرف ایک اشارے سے تبدیل کر سکتا ہے اور اُس کا صرف ایک اشارہ ہی اس کے لیے بھی کافی ہے کہ یہ دوبارہ ایک دوسری مادی شکل میں پیدا ہو جائے۔

یہ تو ہے قیامت کے امکان کا معاملہ جسے اب کسی علمی و عقلی دلیل سے رد نہیں کیا جا سکتا۔ اب رہا یہ سوال کہ اس کو ضرور واقع ہونا چاہیے تاکہ انسان کو اس کے اچھے اعمال کی جزا اور برے اعمال کی سزا ملے، تو جو شخص انسان کی اخلاقی ذمہ داری کا قائل ہے اور یہ بھی مانتا ہے کہ حُسنِ خدمت کا انعام اور جرم کی سزا اِس اخلاقی ذمہ داری کا لازمی تقاضا ہے اُس کے لیے یہ تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ آخرت ضرور ہونی چاہیے دنیا میں معاشرے اور ریاست کا کوئی نظام ایسا نہیں ہے جو ہر جرم کی سزا اور ہر حُسنِ عمل کا انعام دے سکتا ہو۔ یہ کہنا کہ مجرم کے لیے اس کے ضمیر کی ملامت ہی کافی سزا اور محسن کے لیے اس کے ضمیر کا اطمینان ہی کافی جزا ہے، ایک بے معنی فلسفہ طرازی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ جس شخص نے کسی بے گناہ کو قتل کیا اور اس کے بعد فوراً ہی وہ کسی حادثے سے دوچار ہو کر مر گیا، اس کے ضمیر کو کب اتنی مہلت ملی کہ وہ اسے ملامت کرتا؟ اور جو شخص حق اور انصاف کی خاطر لڑائی پر گیا اور وہاں اچانک ایک بم پڑنے سے اس کے پرخچے اڑ گئے اس کے ضمیر کو یہ اطمینان حاصل ہونے کا موقع کب ملا کہ اس نے ایک اچھے مقصد کے لیے جان دی ہے؟ پس حقیقت یہ ہے کہ آخرت کے عقیدے سے فرار کے لیے جتنے بہانے تراشے جاتے ہیں وہ سب بے معنی ہیں۔ انسان کی عقل چاہتی ہے، اس کی فطرت چاہتی ہے کہ انصاف ہو، مگر دنیا کی موجودہ زندگی میں انصاف، اور وہ بھی ٹھیک ٹھیک اور پورا پورا انصاف ممکن نہیں ہے۔ وہ اگر ہو سکتا ہے تو آخرت ہی میں ہو سکتا ہے اور خدائے علیم و خبیر ہی کے حکم سے ہو سکتا ہے۔ آخرت کی ضرورت کا انکار دراصل انصاف کی ضرورت کا انکار ہے۔

عقل اِسی حد تک انسان کو لے جا سکتی ہے کہ آخرت ممکن ہے اور اُس کو ہونا چاہیے۔ رہی یہ بات کہ وہ یقیناً ہوگی، اِس کا علم صرف وحی کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتا ہے، اور وحی نے یہ بتا دیا ہے کہ "جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ ضرور واقع ہونے والی ہے"۔ اس علم تک ہم عقلی استدلال سے نہیں پہنچ سکتے، البتہ اس کے برحق ہونے کا یقین ہمیں اِس بنا پر حاصل ہوتا ہے کہ جس بات کی خبر وحی دے رہی ہے وہ ممکن بھی ہے اور اس کو ضرور ہونا بھی چاہیے۔

ضمیمہ ۴

بسلسلۂ الطارق، حاشیہ ۳

سورۂ طارق آیات ۶-۷ کی تشریح کرتے ہوئے جو کچھ ہم نے حاشیہ ۳ میں لکھا ہے، اس پر ایک ڈاکٹر صاحب نے ہمیں لکھا کہ:

"آپ کی تشریح میں نے بغور کافی دفعہ پڑھی ہے لیکن میں سمجھ نہ سکا۔ جہاں تک عملی مشاہدے کا تعلق ہے تو یہ مادہ فوطے (TESTICLE) میں پیدا ہوتا ہے اور باریک باریک نالیوں کے ذریعے بڑی نالیوں میں گزرتا ہُوا پیٹ کی دیواروں میں کولہے کی ہڈی کے عین متوازی ایک نالی (INGUINAL CANAL) میں سے گزر کر قریب ہی ایک غدود میں داخل ہو جاتا ہے۔ غدود کا نام (PROSTATE) ہے۔ اور پھر وہاں سے رطوبت لے کر اس کا اخراج ہوتا ہے۔ سینے کی ہڈی اور ریڑھ کی ہڈی کے درمیان سے اس کے گزرنے کو مَیں سمجھ نہ سکا۔ البتہ اس کا کنٹرول ایک ایسے نروس سسٹم سے ہوتا ہے جو کہ سینے کی ہڈی اور ریڑھ کی ہڈی کے درمیان جال کی صورت میں پھیلا ہُوا ہے۔ وہ بھی ایک خاص حد تک۔ اس کا کنٹرول ایک اور غدود جو کہ دماغ میں ہوتا ہے اُس کی رطوبت سے ہوتا ہے۔ لیکن سوال یہاں اخراج کا ہے (جو کہ ایک نالی کے ذریعے ہی ہو سکتا ہے)۔ میری درخواست ہے کہ آپ مجھے مفصّل لکھیں کہ اس کی تفسیر کیا ہے۔ میں نے آپ کو اس لیے تکلیف دی ہے (جس کے لیے معذرت خواہ ہوں) کہ آپ سائنٹیفک علم پر یقین رکھتے ہیں۔"

اس کے جواب میں ہم نے نومبر ۱۹۷۱ء کے رسالۂ ترجمان القرآن میں لکھا کہ:

آپ چونکہ ایک ڈاکٹر ہیں اس لیے اس بات کو زیادہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ اگرچہ جسم کے مختلف حصّوں کے افعال (FUNCTIONS) الگ الگ ہیں، لیکن کوئی حصّہ بھی بجائے خود تنہا کوئی فعل نہیں کرتا بلکہ دوسرے

اعضاء کے تعامل (CO-ORDINATION) سے اپنا کام کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ مادۂ منویہ بننے کی جگہ بلاشبہ فوطہ ہے اور وہاں سے اس کا اخراج بھی ایک خاص راستے سے ہوتا ہے۔ لیکن معدہ، جگر، پھیپھڑے، دل، دماغ، گردے اگر اپنا کام نہ کر رہے ہوں تو کیا مادۂ منویہ کے بننے اور نکلنے کا یہ نظام بطورِ خود اپنا کام کر سکتا ہے؟ اسی طرح مثال کے طور پر دیکھیے۔ پیشاب گردے میں بنتا ہے اور ایک نالی کے ذریعے سے مثانے میں پہنچ کر پیشاب کے راستے خارج ہوتا ہے۔ مگر کس چیز کے نتیجے میں؟ خون بنانے والے اور اس کو سارے جسم میں گردش دے کر گردے تک پہنچانے والے اعضاء اگر اپنا کام نہ کر رہے ہوں تو کیا تنہا گردہ خون سے وہ مادے الگ کر کے مثانے میں بھیج سکتا ہے جن کے مجموعے کا نام پیشاب ہے؟ اسی لیے قرآن مجید میں یہ نہیں فرمایا گیا ہے کہ یہ مادہ ریڑھ کی ہڈی اور سینے کی ہڈیوں میں سے نکلتا ہے بلکہ یہ فرمایا گیا ہے کہ ان دونوں کے درمیان جسم کا جو حصّہ واقع ہے اُس سے یہ مادہ خارج ہوتا ہے۔ یہ اِس بات کی نفی نہیں ہے کہ مادۂ منویہ کے بننے اور اس کے اخراج کا ایک خاص نظامِ عمل (MECHANISM) ہے جسے جسم کے کچھ خاص حصے انجام دیتے ہیں، بلکہ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نظامِ عمل مستقل بالذات نہیں ہے یہ اپنا کام اُس پُورے نظامِ اعضاء کے مجموعی عمل کی بدولت انجام دیتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے صُلب اور ترائب کے درمیان رکھ دیا ہے۔ اِسی لیے میں نے یہ وضاحت کی ہے کہ پُورا جسم اس میں شامل نہیں ہے، کیونکہ اگر ہاتھ اور پاؤں کٹ جائیں تب بھی یہ نظام کام کرتا رہتا ہے، البتہ صُلب اور ترائب کے درمیان جو اعضائے رئیسہ واقع ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی باقی نہ رہے تو یہ نظام اپنا عمل جاری نہیں رکھ سکتا۔"

اس سوال و جواب کو پڑھنے کے بعد دو مختلف مقامات سے دو ڈاکٹروں نے ہمیں جو طبّی معلومات بہم پہنچائی ہیں وہ درج ذیل ہیں:

علم الجنین (EMBRYOLOGY) کی رو سے یہ ثابت شدہ حقیقت ہے کہ جنین (FOETUS) کے اندر اُنثیین (TESTES) یعنی وہ غدود جن سے مادۂ منویہ پیدا ہوتا ہے، ریڑھ کی ہڈی اور پسلیوں کے درمیان گردوں کے قریب ہوتے ہیں جہاں سے بعد میں یہ آہستہ آہستہ فوطوں میں اتر جاتے ہیں۔ یہ عمل ولادت سے پہلے اور بعض اوقات اس کے کچھ بعد ہوتا ہے۔ لیکن پھر بھی ان کے اعصاب اور رگوں کا منبع ہمیشہ وہی مقام (بَیْنَ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ) ہی رہتا ہے۔ بلکہ ان کی شریان (ARTERY) پیٹھ کے قریب شہ رگ (AORTA) سے نکلتی ہے اور پورے پیٹ کا سفر طے کرتی ہوئی ان کو خون مہیا کرتی ہے۔ اس طرح حقیقت

میں اُنثیین پیٹھ ہی کا جزء ہیں جو جسم کا زیادہ درجۂ حرارت برداشت نہ کرنے کی وجہ سے فوطوں میں منتقل کر دیے گئے ہیں۔ علاوہ بریں مادۂ منویہ گرچہ اُنثیین پیدا کرتے ہیں اور وہ کیسۂ منویہ (SEMINAL VESICLES) میں جمع ہو جاتا ہے، مگر اس کے اخراج کا مرکزِ تحریک بَيْنَ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ ہی ہوتا ہے اور دماغ سے اعصابی رو جب اس مرکز کو پہنچتی ہے تب اس مرکز کی تحریک (TRIGER ACTION) سے کیسۂ منویہ سکڑتا ہے اور اس سے ماءِ دافق پچکاری کی طرح نکلتا ہے۔ اس لیے قرآن کا بیان ٹھیک ٹھیک علمِ طب کی جدید تحقیقات کے مطابق ہے۔

الحمد للہ کہ اِن صفحات میں تفسیر قرآن کا جو سلسلہ شروع کیا گیا تھا وہ مکمل ہو گیا۔ رسالہ ترجمان القرآن کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس کے مجلدات میں قرآن پاک کی پوری تفسیر شائع ہوئی ہے۔

اب جناب نعیم صدیقی صاحب ایک رفیق کار کے ساتھ میرے تمام مضامین اور کتابوں میں سے وہ حصے نکال کر مرتب کر رہے ہیں جو سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ہیں۔ ان مضامین میں متعدد مقامات پر بڑے بڑے خلا ہیں جن کو میں نئے ابواب لکھ کر بھر رہا ہوں۔ آئندہ ان ابواب میں سے کوئی باب ان صفحات میں درج کیا جاتا رہے گا۔

ابوالاعلیٰ

قوموں کا عروج وزوال

قرآن کے آئینہ میں

از طیب شاہین لودھی

قوموں کا عروج وزوال، اسباب وعوامل کے ضابطوں کے اسی طرح تابع ہے جس طرح افراد۔ فرد کو اپنی بدعملی کی پاداش میں جس طرح دنیا اور آخرت میں خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے اسی طرح قومیں اپنی فکر و نظر کی گمراہی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے عذاب کی مستحق قرار پاتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہدایت کے مطابق اپنی فکر وعمل کو ڈھالنے والی قوم اس کے انعامات کی حقدار بنتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان اصولوں کا اعلان بار بار اپنے رسولوں کی معرفت کر دیا ہے:

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِيْدٌ۔ (ابراہیم - ۷)

اور یاد رکھو تمہارے رب نے خبردار کر دیا تھا کہ اگر تم شکر گزار بنو گے تو میں تمہیں اور زیادہ نوازوں گا اور اگر کفرانِ نعمت کرو گے تو میری سزا بہت سخت ہے۔

قوموں کے عروج وزوال کے یہ اصول اس قدر اٹل ہیں کہ کوئی قوم بھی اپنی فکر و نظر کی گمراہی اور بدعملی کی پاداش سے نہ بچ سکی۔ اور جب اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی مہلت ختم ہو گئی تو اللہ تعالیٰ کے عذاب کی گرفت سے انہیں کوئی تدبیر محفوظ نہ رکھ سکی، کیونکہ

لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ۔ (یونس - ۶۴)

اللہ کی باتیں بدل نہیں سکتیں۔

وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا۔ (بنی اسرائیل - ۷۷)

اور ہمارے طریق کار میں تم کوئی تغیر نہ پاؤ گے۔

سُنَّةَ اللّٰهِ فِی الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا۔ (الاحزاب - ۶۲)

یہ تھا طریق کار پہلے گزرے ہوئے لوگوں کے بارے میں اور تم اللہ تعالیٰ کے طریق کار میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔

ان اصولوں کو ذہن میں رکھ کر جب ہم قرآن کریم کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس کے اوراق میں ہمیں متعدد قوموں کے عروج و زوال کی داستانیں ایک عبرت انگیز پیرائے میں بکھری ہوئی ملتی ہیں۔قرآن اپنے قاری سے مطالبہ کرتا ہے کہ قوموں کی داستانوں کو محض قصے کہانیاں سمجھ کر ان سے سرسری انداز میں نہ گزر جاؤ بلکہ دل کی آنکھیں کھول کر عبرت حاصل کرو۔مغضوب اقوام پر نازل شدہ عذاب کو محض فلسفیانہ نقطۂ نظر سے نہ دیکھو اور ان کو موسموں کے تغیّر و تبدّل اور فطرت کے طبعی عوامل پر محمول نہ کرو۔عروج و سقوط کی ان داستانوں میں دراصل پاداشِ عمل کے اصول پنہاں ہیں۔قرآن ہمیں متنبّہ کرتا ہے کہ ہم جب اِن قصص کو پڑھیں تو اپنی روش کا بھی جائزہ لیں کہ کہیں ہم بھی اسی راستے پر تو گامزن نہیں ہو گئے جو تباہ کن اور ہولناک گھاٹیوں میں جا کر ختم ہوتا ہے، جہاں سے واپسی ممکن نہیں اور فنا ہی یقینی ہے۔

كَلَّآ إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝ فَمَن شَآءَ ذَكَرَهُ ۝ (عبس۔۱۱۔۱۲)

ہر گز نہیں، یہ تو ایک یاددہانی ہے جس کا جی چاہے اس سے نصیحت پکڑے۔

قرآن کا مقصد ہے کہ انسان ماضی کے آئینے کو سامنے رکھ کر اپنے حال اور مستقبل کی اصلاح کرے اور سلامتی کا راستہ یہی ہے کہ خدا کی باغی قوموں کی روش ترک کر کے انبیاء کرام کی لائی ہوئی ہدایت کو مشعلِ راہ بنایا جائے۔قرآن پاک کی اس آئینہ نمائی کی چند جھلکیاں ذیل میں ملاحظہ ہوں:۔

أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ كَانُوا مِن قَبْلِهِمْ ۚ كَانُوا هُمْ أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَآثَارًا فِي الْأَرْضِ فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ وَمَا كَانَ لَهُم مِّنَ اللَّهِ مِن وَاقٍ۔ (المؤمن۔۲۱)

اور کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ اُن لوگوں کا انجام دیکھتے جو اِن سے پہلے گزر چکے ہیں۔وہ زمین میں اِن سے زیادہ طاقت ور اور با اثر تھے۔پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے گناہوں کی پاداش میں پکڑ لیا اور اُن کو اللہ کی پکڑ سے کوئی بچانے والا نہ تھا۔

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ۔ (یوسف۔۱۰۹)

پھر کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ اُن قوموں کا انجام انہیں نظر نہ آیا جو ان سے پہلے گزر چکی ہیں؟

قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ

کہو، زمین میں ذرا چل پھر کر دیکھو مجرموں

كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ۔ (النمل - ۶۹)

کا کیا انجام ہو چکا ہے۔

فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ
(الاعراف - ۱۰۳)

پس دیکھو ان مفسدوں کا کیا انجام ہوا۔

وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ۔
(یونس - ۷۳)

اور ان سب لوگوں کو ہم نے غرق کر دیا جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا پس دیکھ لو کہ جن کو متنبہ کیا گیا تھا اُن کا کیا انجام ہوا۔

وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَجُنُوْدُهٗ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اِلَيْنَا لَا يُرْجَعُوْنَ فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ۔
(القصص - ۳۹ - ۴۰)

اُس نے (یعنی فرعون نے) اور اس کے لشکروں نے زمین میں بغیر کسی حق کے اپنی بڑائی کا گھمنڈ کیا اور سمجھے کہ انہیں کبھی ہماری طرف پلٹنا نہیں ہے۔ آخر کار ہم نے اسے اور اُس کے لشکروں کو پکڑا اور انہیں سمندر میں پھینک دیا۔ اب دیکھ لو ظالموں کا کیسا انجام ہوا۔

اَلَمْ يَاْتِهِمْ نَبَاُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ وَقَوْمِ اِبْرٰهِيْمَ وَاَصْحٰبِ مَدْيَنَ وَالْمُؤْتَفِكٰتِ اَتَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۔
(التوبہ - ۷۰)

کیا ان لوگوں کو اپنے پیش روؤں کی تاریخ نہیں پہنچی؟ نوح کی قوم۔ عاد۔ ثمود۔ اور ابراہیم کی قوم اہلِ مدین اور وہ بستیاں جنہیں الٹ دیا گیا۔ اُن کے رسول اُن کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے پھر یہ اللہ کا کام نہ تھا کہ اُن پر ظلم کرتا مگر وہ آپ ہی اپنے اوپر ظلم کرنے والے تھے۔

وَتِلْكَ عَادٌ جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهٗ وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۔ ہود ۵۹ - ۶۰

اور یہ تھے عاد۔ اپنے رب کی آیات سے انہوں نے انکار کیا اور اس کے رسولوں کی بات نہ مانی اور ہر جبار دشمن حق کی پیروی کرتے رہے۔ آخر کار دنیا میں بھی اُن پر پھٹکار پڑی

اور قیامت کے روز بھی۔

فَكَأَيِّن مِّن قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَقَصْرٍ مَّشِيدٍ - أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا أَوْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ -

(الحج - ۴۵ - ۴۶)

پس کتنی ہی خطا کار بستیاں ہیں جن کو ہم نے تباہ کیا اور آج وہ اپنی چھتوں پر الٹی پڑی ہوئی ہیں۔ کتنے ہی کنویں بیکار اور کتنے ہی قصر کھنڈر بنے ہوئے ہیں۔ کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ ان کے دل سمجھنے والے یا کان سننے والے ہوتے۔ حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں مگر وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔

وَلَقَدْ أَتَوْا عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِي أُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ - أَفَلَمْ يَكُونُوا يَرَوْنَهَا بَلْ كَانُوا لَا يَرْجُونَ نُشُورًا -

(الفرقان - ۴۰)

اور اُس بستی پر تو اُن کا گزر ہو چکا ہے جس پر بدترین بارش برسائی گئی تھی۔ کیا انہوں نے اُس کا حال دیکھا نہ ہوگا؟ مگر یہ تو موت کے بعد دوسری زندگی کی توقع ہی نہیں رکھتے۔

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ إِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ الَّتِي لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ وَثَمُودَ الَّذِينَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ وَفِرْعَوْنَ ذِي الْأَوْتَادِ الَّذِينَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ فَأَكْثَرُوا فِيهَا الْفَسَادَ فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ - إِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ -

(الفجر - ۶ - ۱۴)

کیا تو نے دیکھا نہیں کہ تیرے رب نے کیا کیا ستونوں والے عادِ ارم کے ساتھ جس کے مانند ملکوں میں کوئی قوم پیدا نہیں کی گئی تھی، اور ثمود کے ساتھ جنہوں نے وادی میں چٹانیں تراشی تھیں، اور فرعون میخوں والے کے ساتھ جنہوں نے ملکوں میں سرکشی کی روش اختیار کی اور فساد کی انتہا کر دی۔ پس تیرے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا برسا دیا۔ بے شک

نیز ارب گھات میں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قوموں پر دنیاوی عذاب کی مختلف صورتیں بیان کی ہیں۔ ہم یہاں اختصار کے ساتھ اُن کی وضاحت کرتے ہیں۔

قوم نوحؑ :۔

حضرت نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قوم کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی تمام آسائشوں سے نوازا۔ لیکن اس کے باوجود یہ بدبخت قوم شرک جیسی عظیم گمراہی میں مبتلا ہو گئی۔ پھر اس قوم کے اندر شرک کے باعث دوسری بے شمار اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی گمراہیوں نے جنم لیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس قوم کی فہمائش کے لیے حضرت نوح علیہ السلام کو مبعوث کیا۔ آپ ساڑھے نو سو برس تک اپنی قوم کی اصلاح کی کوشش کرتے رہے۔ اُن کی ایک ہی پکار تھی کہ

يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۔ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (الاعراف - ۵۹)

اے میری قوم خدا کی بندگی اختیار کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ میں تمہارے معاملے میں ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔

اس کے جواب میں قوم کے سرمایہ دار اور خوشحال لوگوں نے اُن کا تمسخر اُڑایا اور اللہ تعالیٰ کی ہدایت کو گمراہ کن نظریات سے تعبیر کیا اور الزام لگایا کہ وہ اِن نظریات کے ذریعے اپنی قوم پر برتری حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ان کے یہ اعتراضات نقل فرمائے ہیں:۔

اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۔ (الاعراف - ۶۰)

ہم کو تو یہ نظر آتا ہے کہ تم صریح گمراہی میں مبتلا ہو۔

مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ۔ (المومنون - ۲۴)

یہ شخص کچھ نہیں ہے مگر ایک بشر تم ہی جیسا۔ اس کی غرض یہ ہے کہ تم پر برتری حاصل کرے۔

اور یوں قوم کے سرمایہ داروں اور سرداروں نے حضرت نوح علیہ السلام کی اصلاح کی کوششوں کی بے حد مخالفت کی اور وہ سرکشی اور بغاوت میں اس حد تک بڑھ گئے کہ انہوں نے حضرت نوح علیہ السلام کو سنگسار کر

دینے کی دھمکی دی۔

قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ یٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ۔ (الشعراء - ۱۱۶)	انہوں نے کہا اے نوح اگر تو باز نہ آیا تو تو ضرور سنگسار کر دیا جائے گا۔

اور ان ظالموں نے یہاں تک کہہ دیا کہ ہماری گمراہیوں اور بد اعمالیوں کی پاداش میں جس عذاب کی تم ہمیں دھمکی دے رہے ہو وہ لے آؤ۔

قَالُوْا یٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ۔ (ھود - ۳۲)	اُن لوگوں نے کہا کہ اے نوح تم نے ہم سے جھگڑا کیا اور بہت کر لیا۔ اب تو بس وہ عذاب لے آؤ جس کی تم ہمیں دھمکی دیتے ہو اگر تم سچے ہو۔

آخر اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں کو دی ہوئی مہلت ختم کر دی۔ حضرت نوح علیہ السلام صدیوں اس قوم کو اللہ کے عذاب سے بچانے کی کوشش کرتے رہے اور ہدایت الٰہی کے مطابق ان کے نظریات کی تطہیر کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن جب یہ لوگ اپنے خانہ ساز اور گمراہ نظریات اور شرک پر مبنی اعمال پر زیادہ متشدد ہو گئے اور ان کی اصلاح اور نصیحت پذیری کی کوئی صورت باقی نہ رہی تو اللہ کے عذاب نے انہیں آ لیا اور ایسی ایسی جگہوں سے عذاب الٰہی کے چشمے پھوٹ پڑے جہاں سے اس کے آنے کا وہ تصور بھی نہ کر سکتے تھے ایک ایسا ہولناک سیلاب ان پر چھا گیا کہ اس خطہ زمین پر کوئی مجرم اپنی جان نہ بچا سکا۔ خود حضرت نوح علیہ السلام کے سرکش اور نافرمان اور گمراہ بیٹے نے بھاگ کر پہاڑوں پر پناہ لینے کی کوشش کی، مگر خدا کے عذاب کی موجوں نے اُسے پہاڑ کی بلندی پر بھی جا کر گھیر لیا۔ پھر حضرت نوح کی نگاہوں کے سامنے طوفان نے اسے نگل لیا اور ایک برگزیدہ رسول بھی اپنے بدکردار بیٹے کو اس کی بدعملی کی پاداش سے نہ بچا سکا۔

قوم سبا:-

حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش سے کئی سو برس پہلے، قوم سبا اپنے زمانے کی انتہائی ترقی یافتہ قوم تھی۔ اہل سبا نے دریاؤں پر بند باندھ کر نہروں کا جال بچھا دیا تھا۔ دنیا کی دوسری اقوام کے ساتھ تجارتی روابط استوار کیے تھے۔ لیکن مادی ترقی کے عروج کے ساتھ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے

سرکشی اور بغاوت کا راستہ اختیار کر لیا۔ انہوں نے مادی ترقی کو ہی زندگی کا منتہائے نظر اور مقصود سمجھ لیا اور ہدایت الٰہی کو پس پشت ڈال دیا۔ وہ آخرت کی زندگی اور خدائے بزرگ و برتر کے سامنے جوابدہی کے منکر ہو گئے اور انہوں نے اُس نظام زندگی کو رد کر دیا جس کی بنیاد وحی الٰہی تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کا فیصلہ کر لیا اور پھر وہی دریا جن کا راستہ روک کر انہوں نے بڑے بڑے بند تعمیر کیے تھے، اور ان سے اپنی سرزمین کو لہلہاتے کھیتوں اور باغات میں تبدیل کیا تھا، اُن کے لیے عذاب کا باعث بن گئے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:۔

لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِي مَسْكَنِهِمْ آيَةٌ ۖ جَنَّتَانِ عَن يَمِينٍ وَشِمَالٍ ۖ كُلُوا مِن رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوا لَهُ ۚ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَرَبٌّ غَفُورٌ ۔ فَأَعْرَضُوا فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ وَبَدَّلْنَاهُم بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ أُكُلٍ خَمْطٍ وَأَثْلٍ وَشَيْءٍ مِّن سِدْرٍ قَلِيلٍ ۔ ذَٰلِكَ جَزَيْنَاهُم بِمَا كَفَرُوا ۖ وَهَلْ نُجَازِي إِلَّا الْكَفُورَ ۔

(سبا ۔ ۱۵۔ ۱۷)

سبا کے لیے اُن کے اپنے مسکن ہی میں ایک نشانی موجود تھی۔ دو باغ دائیں اور بائیں۔ کھاؤ اپنے رب کا رزق اور شکر بجا لاؤ اس کا، ملک ہے عمدہ و پاکیزہ اور پروردگار ہے بخشش فرمانے والا۔ مگر وہ منہ موڑ گئے۔ آخر کار ہم نے اُن پر بند توڑ سیلاب بھیج دیا اور اُن کے پچھلے دو باغوں کی جگہ دو اور باغ انہیں دیے جن میں کڑوے کسیلے پھل اور جھاؤ کے درخت تھے اور کچھ تھوڑی سی بیریاں۔ یہ تھا اُن کے کفر کا بدلہ جو ہم نے اُن کو دیا اور ناشکرے انسان کے سوا کیا ایسا بدلہ ہم کسی کو دیتے ہیں؟

اس طرح قوم سبا کی داستان بعد میں آنے والوں کے لیے عبرت کا سامان بن گئی۔ سبا کے محلوں میں رہنے والے شہزادے بے سروسامانی کی حالت میں ریگستانوں میں حیران اور سرگرداں پھر رہے تھے۔ صدیوں تک اس المیے کو شعراء اپنی نظموں کا موضوع بناتے رہے۔ چنانچہ اعشیٰ نے جس کا شمار عربی شعراء کے طبقہ اول میں ہوتا ہے سبا کی تباہی کو بڑے دردناک الفاظ میں بیان کیا ہے۔ قرآن کریم میں بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:۔

فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ وَمَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۔ (سبا - ۱۹)

آخر کار ہم نے انہیں افسانہ بنا کر رکھ دیا اور انہیں بالکل تتر بتر کر ڈالا۔

قوم عاد:۔

قوم نوح کے بعد عاد اپنے زمانے کی طاقتور اور متمدن قوم تصور کی جاتی تھی، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاذْكُرُوْا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِنْ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ ۔ (الاعراف - ۶۸)

یاد کرو (اللہ کے فضل و انعام کو) کہ نوح کی قوم کے بعد اس نے تم کو خلیفہ بنایا۔

عہد حاضر کی اصطلاح کے مطابق اُن کا معیار زندگی بہت بلند تھا۔ اور اس معیار زندگی کے جاہ و جلال کا اظہار وہ بلا ضرورت بلند و بالا عمارتوں کی تعمیر سے کیا کرتے تھے جسمانی لحاظ سے بھی عاد ایک طاقتور قوم تھی۔ قرآن کریم میں قوم عاد کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَّزَادَكُمْ فِى الْخَلْقِ بَصْطَةً ۚ (الاعراف - ۶۸)

اور تمہیں جسمانی ساخت میں خوب تنومند کیا۔

مگر اس بلند معیار زندگی اور جسمانی قوت کی وجہ سے وہ گھمنڈ اور تکبر کا شکار ہو گئے آخرت کی جوابدہی سے غافل ہو گئے اور گوناگوں اعتقادی اور عملی گمراہیوں میں مبتلا ہو گئے۔ ان کے اعتقادات میں شرک نفوذ کر گیا اور اس مکروہ بیماری نے اور بہت سی معاشرتی اور سیاسی عوارض کو جنم دیا۔ انہیں اپنے بلند معیار زندگی کی نمود و نمائش کا اس درجہ شوق تھا کہ انہوں نے اپنی سرزمین پر کوئی ایسا بلند ٹیلہ نہ چھوڑا، جس پر انہوں نے محض اظہار فخر کے طور پر ایک عالیشان عمارت تعمیر نہ کر دی ہو۔ قرآن کریم میں اُن کے اس شوق فضول کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ ۝ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ۔ (الشعراء - ۱۲۸ - ۱۲۹)

یہ تمہارا کیا حال ہے کہ ہر اونچے مقام پر لاحاصل ایک یادگار عمارت بنا ڈالتے ہو۔ اور بڑے بڑے قصر تعمیر کرتے ہو گویا تمہیں ہمیشہ رہنا ہے۔

دوسری طرف ان کی اخلاقی پستی اور اعتقادی گمراہی کی یہ حالت تھی کہ کوئی پتھر ایسا نہیں تھا جو اُن کا مسجود نہ تھا اور کوئی قبر ایسی نہ تھی جس سے یہ لوگ مرادیں نہ مانگتے تھے۔ دنیا کی تمام اخلاقی برائیاں ان میں بدرجہ اَتَم موجود تھیں۔ قوم کے کمزور اور نچلے طبقے حکمرانوں اور رؤسا کے ظلم کی چکی میں پس رہے تھے۔ کمزوروں اور غریبوں کے لیے ان

کے دل انصاف سے خالی تھے۔ قرآن کریم کے بیان کے مطابق اُن کی پڑوسی قومیں بھی اُن کے جبر و تشدد اور ظلم و استحصال سے محفوظ نہ تھیں ۔

اِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ (الشعراء - ۱۳۰) — اور جب کسی پر ہاتھ ڈالتے ہو تو جبار بن کر ڈالتے ہو۔

جب زمین قومِ عاد کے گناہوں کے بوجھ سے بھر گئی اور مخلوق خدا ان کے ظلم و تشدد سے تنگ آگئی تو اللہ تعالیٰ نے اُن کی فہمائش کے لیے حضرت ہود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ان میں مبعوث کیا۔ اس قوم نے اللہ کے رسول کے ساتھ وہی سلوک کیا جو ہر بگڑی ہوئی قوم اپنے مصلحین کے ساتھ کرتی ہے۔ حضرت ہود علیہ السلام نے انہیں دعوت اسلام دیتے ہوئے فرمایا :۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۔ (الشعراء ۱۳۱) — تم لوگ اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

لیکن حق و صداقت کی اس پکار کا جواب قوم عاد نے یہ دیا کہ :۔

سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَوَعَظْتَ اَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ الْوَاعِظِيْنَ ۔ اِنْ هٰذَآ اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِيْنَ ۔ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ۔ (الشعراء ۱۳۶ - ۱۳۸) — تم نصیحت کرو یا نہ کرو ہمارے لیے سب یکساں ہے۔ یہ باتیں تو یونہی ہوتی چلی آئی ہیں اور ہم عذاب میں مبتلا ہونے والے نہیں۔

آخر کار جب اُن کی سرکشی تمام حدود پھاند گئی، انہوں نے ہدایت الٰہی کو تضحیک و استہزاء کا مسلسل نشانہ بنا لیا اور حضرت ہود بے بس ہو گئے تو اللہ کے عذاب نے اُن کو آلیا۔ پہلے تین چار سال اُن پر قحط سالی کے وارد ہوئے۔ پھر طوفان کے آثار نمودار ہوئے جسے یہ لوگ بارش کے آثار سمجھ کر بہت خوش ہوئے۔ لیکن حقیقت میں یہ وہ طوفان تھا جو اللہ کا عذاب اور قہر بن کر قوموں پر آیا کرتا ہے۔ یہ طوفان کلیجہ جھلسا دینے والی ایک تیز و تند باد صرصر کی صورت میں نمودار ہوا، یہ باد صرصر ان کی بستیوں پر بلا انقطاع آٹھ دن اور سات راتوں تک چلتی رہی۔ اس زہریلی ہوا نے اس خطّے کی تمام روئیدگی کو جلا کر راکھ کر دیا اور اس ظالم قوم کے تمام افراد اور ان کی تمام بستیوں کو پیوند خاک کر دیا۔ یہ بادِ سموم جب ختم ہوئی تو چار سُو تباہی و بربادی کے ہولناک مناظر ہویدا تھے اور ہر طرف ان ظالموں کی لاشیں کھجور کے سوکھے تنوں کی طرح بکھری پڑی تھیں۔ قرآن کریم میں قوم عاد کی اس تباہی کا ذکر نہایت عبرت انگیز انداز میں کیا گیا ہے :۔

فَلَمَّا رَأَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ أَوْدِيَتِهِمْ قَالُوا هَٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا ۚ بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُم بِهِ ۖ رِيحٌ فِيهَا عَذَابٌ أَلِيمٌ ۔ تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍ بِأَمْرِ رَبِّهَا ۔ فَأَصْبَحُوا لَا يُرَىٰ إِلَّا مَسَاكِنُهُمْ ۔ كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِينَ ۔

(الاحقاف ۲۴-۲۵)

اُن لوگوں نے جب اس بادل کو اپنی وادیوں کی طرف آتے دیکھا تو کہنے لگے کہ یہ تو بادل ہے جو ہم پر بارش برسائے گا۔ نہیں نہیں بلکہ یہ وہی چیز ہے جس کی تم جلدی مچا رہے تھے۔ ایک آندھی ہے جس میں دردناک عذاب ہے۔ وہ ہر چیز کو اپنے رب کے حکم سے تہس نہس کر دے گی چنانچہ وہ ایسے ہو گئے کہ بجز ان کے گھروں کے اور کچھ نہ دکھائی دیتا تھا۔ ہم مجرموں کو یونہی سزا دیا کرتے ہیں۔

فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا فِي أَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ لِّنُذِيقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَخْزَىٰ ۖ وَهُمْ لَا يُنصَرُونَ ۔ (حم السجدہ ۱۶)

ہم نے اُن پر ایک ہوائے تند ایسے دنوں میں بھیجی جو منحوس تھے تاکہ ہم انہیں دنیوی حیات میں رسوائی کے عذاب کا مزا چکھائیں اور آخرت کا عذاب اور زیادہ رسوا کن ہے اور اُن کو کوئی مدد نہ پہنچے گی۔

وَفِي عَادٍ إِذْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيحَ الْعَقِيمَ ۔ مَا تَذَرُ مِن شَيْءٍ أَتَتْ عَلَيْهِ إِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيمِ (الذاریات ۴۱-۴۲)

اور عاد کے قصہ میں بھی عبرت ہے جبکہ ہم نے اُن پر نامبارک آندھی بھیجی، جس چیز پر وہ گزرتی تھی اُس کو بوسیدہ کر کے رکھ دیتی تھی۔

وَأَمَّا عَادٌ فَأُهْلِكُوا بِرِيحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَثَمَانِيَةَ أَيَّامٍ حُسُومًا فَتَرَى الْقَوْمَ فِيهَا صَرْعَىٰ كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ (الحاقۃ ۶-۷)

رہے عاد تو وہ ایک تند و تیز ہوا سے ہلاک کیے گئے جس کو اللہ تعالیٰ نے اُن پر سات رات اور آٹھ دن متواتر مسلط رکھا تو اس قوم کو اس طرح گرا ہوا دیکھتا کہ گویا وہ کھجوروں کے کھوکھلے تنے ہیں۔

إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا فِي يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ تَنزِعُ النَّاسَ كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنقَعِرٍ ۔

(القمر ۱۹-۲۰)

ہم نے اُن پر ایک تند ہوا بھیجی ایک مستقل نحوست کے دن میں اور وہ ہوا لوگوں کو اس طرح اکھاڑ اکھاڑ پھینکتی تھی کہ گویا وہ اکھڑی ہوئی کھجوروں کے تنے ہیں۔

چنانچہ وادئی احقاف میں آج تک نحوست برس رہی ہے۔ (باقی)

تحریکِ اسلامی کی کامیابیاں

(سید اسعد گیلانی)

تحریک اسلامی برپا ہوتے ہی بیک وقت دو کامیابیوں کے میدان میں قدم رکھ دیتی ہے۔ دنیا میں فلاحِ انسانیت کے لیے نظامِ اسلامی کا قیام، اور آخرت میں اللہ کی رضا جوئی کے لیے احکام الٰہی اور بندگیِ رب کی بجا آوری۔ دنیا میں یہ واحد اور منفرد تحریک ہے جس کا ہدف دو کامیابیوں کا حصول ہوتا ہے اور بالعموم یہ دونوں میں کامیابیاں حاصل کرتی ہے، ورنہ دو میں سے ایک کامیابی تو لازماً اس کا مقدر ہوتا ہے۔

تحریک اسلامی کی جدوجہد بدی پر نیکی کے غلبے، ظلم و زیادتی پر عدل و انصاف کے غلبے، غنڈہ گردی اور مردم آزاری پر شرافت و خدمت خلق کے غلبے، تفریق و انتشارِ انسانیت پر مساوات و اتحاد کے غلبے، الحاد اور بے دینی پر دینداری کے غلبے، خدا ناترسی پر خدا ترسی کے غلبے اور فی الجملہ باطل پر حق کے غلبے کی جدوجہد ہوتی ہے۔ اس جدوجہد کا پہلا ہدف انسان کے داخلی بگاڑ کی اصلاح ہے۔ اس کا دوسرا ہدف انسانوں کے پورے معاشرے کی اصلاح ہے۔ اور اس کا تیسرا ہدف انسانی معاشرے پر اثر انداز ہونے والے ان تمام اجتماعی اداروں کی اصلاح ہے جو انسان نے اپنی اجتماعی زندگی کے مختلف شعبوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے قائم کیے ہیں، جن میں حکومت کا ادارہ سب سے بڑا ہے۔ حکومت کی اصلاح ہونے سے انسانی معاشرے کے مختلف شعبوں کی اصلاح کے لیے قوت و اختیار اور اس کے وسائل میسر آجاتے ہیں۔ خصوصاً آج کے اس دور میں جس طرح حکومتی اداروں کا دائرۂ اثر وسیع ہو گیا ہے اور اس نے زندگی کے ہر گوشے پر اثر انداز ہونا شروع کر دیا ہے، ایسی صورت میں تو حکومت کی اصلاح کے بغیر معاشرے کی کوئی قابلِ ذکر اصلاح بھی نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ جیسے جیسے حکومتی ادارے انسانی معاشرے پر اثر انداز ہونے میں وسعت اختیار کرتے چلے گئے انسانوں کی اصلاح کے لیے نازل ہونے والے الٰہی احکام میں بھی اجتماعی زندگی سے متعلق ہدایات کا اضافہ ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ جب اللہ کی طرف

سے انسانوں کے لیے اصلاحات کا آخری احکام نامہ قرآن کی صورت میں اتارا گیا تو وہ انسانی زندگی کے تمام شعبوں کے لیے اصلاح کا ایک نہایت وسیع اور جامع پروگرام لے کر آیا اور ساتھ ہی اسے حکومتی اداروں کے ذریعے نافذ کرکے اس کے نزول کا مقصد اور طریقِ کار بھی واضح کر دیا گیا۔ گویا اللہ کے آخری رسولؐ کا دین خود رسولؐ پاک کی سنت کے عین مطابق اب حکومت کے ذریعے ہی کامل طور پر نفاذ کے لیے اتارا گیا ہے۔ اس لیے اگر کوئی شخص اللہ کے رسولؐ کے نافذ کردہ احکام الٰہی سے کم تر احکام کے نفاذ پر بھی راضی ہو جاتا ہے تو وہ رسولؐ اللہ کی تعلیمات، سنت رسولؐ اور آپؐ کے طریقِ کار سے انحراف کرتا ہے۔ ان حالات میں اللہ کا آخری دین نازل ہو جانے کے بعد کوئی تحریک اس وقت تک حقیقی اسلامی تحریک نہیں کہلا سکتی جب تک وہ افراد اور معاشرے کی اصلاح کے ساتھ ساتھ احکامِ الٰہی کے عملی نفاذ اور حکومت کی اصلاح کے لیے بھی عملی جدوجہد نہیں کرتی۔

دورِ حاضر میں سید مودودی کی برپا کردہ تحریک اسلامی نے فکر و نظر اور عمل و کردار کے میدان میں زبردست کامیابیاں حاصل کیں اور کارنامے سرانجام دیے ہیں۔ ایک طویل دورِ انحطاط و زوال سے گزرنے کے نتیجے میں مسلمانوں کے اندر فکری اور عملی لحاظ سے زبردست تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔ جس گروہ کو یہ سکھایا گیا تھا کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے اس کے اندر دین و دنیا کی زبردست تفریق و تقسیم واقع ہو چکی تھی۔ جن لوگوں کے لیے اطاعت کا محور صرف خدا اور رسولؐ کی ذات کو قرار دیا گیا تھا ان کے اندر خدا کے باغیوں تک کی اطاعت رائج ہو کر رہ گئی تھی۔ جن کا دین اُن کی زندگی کے ہر گوشے پر حاوی ہونے کا مدعی ہے وہ سمٹ سمٹا کر صرف چند عبادات تک محدود ہو گیا تھا۔ جن لوگوں سے کلمۂ طیبہ کا عہد لے کر انہیں اللہ کی بادشاہت کے سوا ہر کسی کی بادشاہت سے بغاوت کا سبق دیا گیا تھا وہ اطاعت اُولوالامر کی آڑ میں کافروں تک کی اطاعت پر نہ صرف راضی ہو گئے بلکہ ان سے خدمتِ باطل کے تمغے اور خطاب تک حاصل کرنے اور اس پر فخر کرنے لگے تھے۔ جن کو دین کے بارے میں ہر مداہنت سے روکا گیا تھا۔ ان کے اندر ترقی پسندی کے مدعی لوگ دینداری کو جنون اور انتہا پسندی قرار دینے لگے تھے۔ جن کو کافروں کی پیروی بلکہ ان کے فیشن تک اختیار کرنے سے منع کیا گیا تھا وہ کفار کے فیشن کو اپنی ترقی پسندی کی علامت قرار دینے لگے تھے غرض زوال و انحطاط کی پستی نے انہیں یہاں تک پہنچا دیا کہ جس چیز کو مٹانے کے لیے ہی مسلمان ملت کو برپا کیا گیا تھا۔ اسی چیز کو قائم کرنے میں اس ملت کی قوتیں اور صلاحیتیں صرف ہونے لگیں تھیں۔

اس فکری اور عملی انحطاط و زوال کے اندر مبتلا مسلمان قوم کے اندر سید مودودی کی تحریک اسلامی نے ۱۹۴۱ء میں اپنے اجتماعی کام کا آغاز کیا۔ صرف ۷۵ افراد کے عزم کر لینے سے اس کام کی ابتدا ہوئی۔ آغاز کے وقت اس کی بے سروسامانی کا یہ عالم تھا کہ کل ۷۴ روپے ۱۴ آنے کے بنیادی اثاثے سے اس کی اجتماعی سرگرمیوں کا آغاز کیا گیا، اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ وہ ننھی سی کونپل بڑھتی اور تناور درخت بنتی چلی گئی۔ گذشتہ ۳۱ سال ۸ مہینے کا دعوتی سفر اس نے اندرونی طور پر شدید بے سروسامانی اور ذرائع و وسائل کی ناقابلِ بیان قلت کے درمیان طے کیا ہے اور بیرونی طور پر خود مسلمانوں اور ان کے حکمرانوں کی طرف سے جن قدر مزاحمتیں اور رکاوٹیں اسے پیش آئی ہیں ایسی رکاوٹیں مسلمانوں کے بدترین کھلے کھلے دشمنوں کو بھی اس قوم کے درمیان پیش نہیں آئیں۔ ہر حکومت نے زبانی طور پر جماعت اسلامی کے اس خیال سے اتفاق کیا کہ مسلمانوں کو اسلام کے مطابق زندگی گزارنے کے مواقع مہیا کیے جانے چاہییں۔ اور ہر حکومت نے جماعت اسلامی کو کلیۃً مٹا دینے کے لیے اپنی طرف سے کبھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ کرسیِ اقتدار پر بیٹھ کر کبھی بھی کسی صاحبِ اقتدار نے فراخ دلی سے جماعت اسلامی کو گوارا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ مقامِ اقتدار سے گر جانے کے بعد اسے جماعت اسلامی سے زیادہ منظم اور محبِ وطن اور راست رو جماعت بھی کوئی دوسری نظر نہیں آئی۔

جماعتِ اسلامی نے گزشتہ پونے ۳۲ سال میں اپنی زوال پذیر، انحطاط یافتہ اور اسلامی نقطۂ نظر سے اپنے بُرے بھلے سے بے خبر قوم کے اندر کام کیا ہے۔ اُس قوم کے اندر جو صدیوں سے نظامِ باطل کی ماری ہوئی، اس سے دبی ہوئی، ظالموں کی شکارگاہ بنی ہوئی اور باطل نظام کے سخت شکنجے میں جکڑ کر، ناگواری کے ساتھ ہی سہی، بہرحال اُس کے سانچے میں ڈھلی ہوئی قوم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بگاڑ کی اس شدت میں مایوسی اور قنوطیت کی انتہائی گہرائی کے باوجود جماعت اسلامی نے اپنی جدوجہد میں قابلِ ذکر کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ وہ کامیابیاں جو بعض فکری تحریکوں کو صدیوں میں بھی حاصل نہیں ہوتیں۔ ان کامیابیوں کا تذکرہ کرنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس تحریک سے وابستہ دین کے مجاہد اپنی تگ و تاز اور اس کی وسعتوں کو خود شناخت کر سکیں اور پھر اپنی رفتار میں تیزی اور مستعدی پیدا کر کے اپنے قدم مزید آگے بڑھائیں۔

ایک نئے نظام کے قیام کی جدوجہد سربکف کارکنوں کا کام ہے۔ یہ ایک تخلیقی عمل ہے۔ جس راستے پر مدت سے کوئی راہ رو نہ گزرا ہو اور نشاناتِ منزل بھی گرد میں دب گئے ہوں وہاں اپنا راستہ بھی خود بنانا پڑتا ہے، اس کی ابتدائی رکاوٹوں کو خود ہی دور کرنا پڑتا ہے اور پھر اپنی منزل کی طرف سفر بھی خود اپنی ہمت

اور شناخت سے جاری رکھنا ہوتا ہے ۔ نئے نظام برپا کرنے والے لوگوں نے ہمیشہ بدترین نامساعد حالات میں کام کیا ہے ۔ یہ پہاڑوں سے نہریں نکالنے اور صحراؤں سے چشمے اچھالنے سے زیادہ مشکل کام ہے ۔ یہ صرف ایک سیاسی عمل ہی نہیں ہے جس کی گاڑی چند سیاسی نعروں کے پہیوں پر چل سکے ۔ یہ خدا ترسی اور آخرت کی جوابدہی کے بنیادی تصور پر دنیا کے ہر عمل کی تشکیلِ نو کا کام ہے ۔ اور باطل کے ہر چیلنج کا ہر میدان میں موثر جواب دینے اور اس کے مقابلے میں زیادہ مضبوط چیلنج رکھ دینے کا کام ہے ۔

اس نقطۂ نظر سے یہ ایک تہائی صدی کی مدت میرے نزدیک بہت مختصر مدت ہے جس میں فکری اور عملی تشکیل و تعمیر کے میدان میں تحریک اسلامی کی کامیابیوں اور کارناموں کا جائزہ لیا جائے ۔ چونکہ میرے نزدیک اس مختصر مدت میں بھی اللہ کے فضل و کرم سے مختلف گوشوں میں بے شمار کام ہوا ہے جس کا احاطہ آسان نہیں ہے اس لیے میں صرف چند پہلوؤں کی طرف مختصر اشارات ہی کروں گا ۔

اسلام ایک تحریک ۔ ایک انقلابی تصور

مسلمانوں میں اسلام کے بارے میں ایک نسلی مذہب کی سی روش پختہ ہو کر رہ گئی تھی ۔ ان کے نزدیک اسلام ذات پات کی طرح باپ سے بیٹے کو نسل میں منتقل ہوتا تھا اور کسی شخص کے لیے کسی مسلمان گھر میں پیدا ہو جانا اس کے لیے بہت کافی تھا کہ اس کے ساتھ مسلمان کی صفت اس طرح چسپاں ہو جائے کہ اس کے سارے مادی فوائد تو اسے حاصل ہوں لیکن اس کے نفاذ و اجراء کی کوئی ذمہ داری اس پر نہ ہو ۔ اس نوعیت کے نسلی تعلق کے اسلام نے مسلمانوں کے اندر اسلام کے بارے میں مکمل بے حسی، جمود، ٹھہراؤ، بلکہ بے شعوری اور بے خبری کی کیفیت پیدا کر دی تھی ۔ تحریک اسلامی نے برپا ہوتے ہی اس جمود کو توڑا ۔ وزنی دلائل کے ساتھ مسلمانوں کے سامنے یہ بات رکھی کہ اسلام محض کوئی نسلی نسبت نہیں ہے بلکہ زندگی کا ایک مقصد، مشن، نصب العین اور ایک تحریک ہے ۔ یہ قائم نہ ہو تو اسے قائم کرنے کے لیے اٹھنا چاہیے ۔ جس طرح سوشلزم کمیونزم جیسی مادی تحریکوں کو جاری اور نافذ کرنے کے لیے لوگ زندگیاں کھپاتے، محنتیں کرتے، قربانیاں دیتے اور جان گسل جدوجہد کرتے ہیں، بالکل اسی طرح اسلام کا بھی اپنے پیروؤں سے یہی مطالبہ ہے کہ جانیں لڑا کر اسے ایک نظامِ حیات کی حیثیت سے نافذ کیا جائے اور اس کام کو زندگی کا مشن بنا لیا جائے ۔ تحریک اسلامی نے اسلام کو ایک جامد مذہب، ایک انفرادی روشِ زندگی سے اٹھا کر اسے ایک تحریک بنا کر پیش کیا ۔ اور اسے لاکھوں زندگیوں کا مشن بنا دیا ۔ آج اسلام ایک تحریک کی حیثیت سے ہمارے معاشرے میں برپا ہے ۔ لاکھوں زندگیاں اسے اپنا مشن بنا کر کام کر رہی ہیں ۔ یہ معمولی کامیابی نہیں ہے جو تحریک اسلامی نے اپنی چند سالہ جدوجہد سے حاصل کی ہے ۔ اس حرکت و تحریک

نے اسلام کے چہرے سے صدیوں کا جما ہوا رنگ اتار دیا ہے۔

دین کا وسیع تصور مسلمانوں میں یہ تصور پختہ ہو گیا تھا کہ اسلام پانچ ارکانِ دین کا نام ہے۔ کلمہ شہادت، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ۔ اور ان میں جس قدر زیادہ سے زیادہ انہماک کر لیا جائے انسان پرہیزگاری اور تقویٰ کی ساری منازل طے کرتا ہوا درجۂ احسان تک جا پہنچتا ہے۔ حتیٰ کہ حدود اللہ سے بے نیاز معاشرے میں رہتے ہوئے ولایتِ الٰہی بھی اسے حاصل ہو جاتی ہے۔ ان پانچ امور میں انہماک سے اس کے سارے اسلامی فرائض پورے ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور اس سے زیادہ جو کچھ ہے وہ دنیا اور اس کی مصروفیات ہیں۔ تجارت، ملازمت، زراعت، رشتہ و تعلق، کاروبار۔ سیاست سب کچھ دنیاداری ہے۔ اور ان میں سیاست تو وہ بدترین دنیاداری ہے جس سے انسان حرص و ہوا میں مبتلا ہوتا، عہدہ و منصب کا لالچی بنتا اولی الامر سے کشمکش کر کے اپنی عاقبت خراب کرتا اور جوڑ توڑ اور سازش کر کے بالآخر سگِ دنیا بن کر رہ جاتا ہے۔ ہر دین دار آدمی کے لیے لازم ہے کہ وہ ان تمام چیزوں سے بے رغبتی ظاہر کرے اور ان میں مبتلا نہ ہو۔ اور سیاست کے تو قریب بھی نہ پھٹکے کیونکہ اس سے بڑھ کر دنیاداری اور کوئی نہیں ہے۔ دینداری کے اس محدود تصور نے بتدریج ہماری قومی زندگی کے ہر اہم مقام سے اخلاق و اسلام کے پابند اور شریف لوگوں کو پسپا کر کے نکال باہر کیا اور شیطان صفت انسانوں کو لا کر ان کے ہاتھ میں مسلمانوں کی زندگی کی باگ ڈور تھما دی شیطان کا یہ کامیاب ترین حربہ تھا جس نے پوری مسلمان قوم کو مجروح کیا اور صدیوں سے اسے اپنے اصل فرائض (فرائض خلافت الٰہیہ) ادا کرنے سے روکے رکھا۔

تحریک اسلامی نے دین داری کے اس محدود آہنی خول کو توڑ کر یہ ثابت کیا کہ دین پوری انسانی زندگی پر حاوی نظامِ حیات ہے۔ اللہ کے احکام کے تحت کام کرتے ہوئے انسان کا ہر فعل عبادت ہے۔ اگر ایک شخص خدا کے احکام کی پابندی کے ساتھ زراعت کرتا، کاروبار اور رشتہ و تعلق قائم کرتا، حتیٰ کہ سیاست و حکومت بھی کرتا ہے تو وہ اللہ کی عبادت کرتا ہے۔ اس لیے کہ اللہ کی بندگی کا دوسرا نام ہی عبادت ہے۔ اور اللہ کے احکام زندگی کے ہر شعبے میں موجود ہیں۔ اور زندگی کے ہر شعبے میں انسان کو اللہ کے ان احکام کی اطاعت کرنی لازم ہے۔ حضورؐ کا یہ فرمان کہ اگر ایک انسان اپنی اولاد کے منہ میں حلال لقمہ بھی ڈالتا ہے تو وہ بھی عبادت ہے اور عادل حاکم اللہ تعالیٰ کے دائیں طرف نور کے منبروں پر بٹھائے جائیں گے اور پھر خود حضورِ اکرمؐ کی سیرت پاک اور نظام اسلامی کے اجراء کی کامیاب جدوجہد، صحابہؓ کرام کی انقلابی

تحریک اور خلافت اسلامیہ کا قیام، یہ سب کچھ اسلام کے ایک جامع اور کامل نظام زندگی ہونے پر گواہ ہیں۔ آج تحریک اسلامی کی رائج کردہ اقامت دین، اسلامی نظام، اور اسلامی نظامِ زندگی کی اصطلاحات ہر تعلیم یافتہ شخص کی زبان پر ہیں اور وہ ان کا پورا مفہوم اچھی طرح سمجھتا ہے۔ تحریک اسلامی کی جدوجہد کے نتیجے میں آج اسلام کو صرف نماز روزے تک محدود سمجھنا ایک دقیانوسی خیال بن گیا ہے اور اسلام کو ایک کامل نظامِ حیات یا ضابطۂ حیات کہنا اور تسلیم کرنا، خود اس کی مخالفت کرنے اور اس سے انحراف کرنے والوں کے لیے بھی فیشن بن چکا ہے۔

اسلامی حکومت کا تصور

تحریک اسلامی کے برپا ہونے سے پہلے یہ تصور عام تھا کہ مسلمانوں کی ہر حکومت اسلامی حکومت ہوتی ہے۔ چنانچہ ان مسلمان حکومتوں کا ہر فعل اسلامی فعل کی حیثیت سے دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا تھا۔ اگر کسی حکومت کا کوئی فعل صریحاً غیر اسلامی بھی دکھائی دیتا تو اس کی تاویل کی جاتی تھی یا اسے ایک انفرادی اور اضطراری فعل قرار دے کر اس کی مجموعی اسلامی حیثیت سے انکار نہیں کیا جاتا تھا۔ اس کے مقابلے میں اگر کوئی مسلمان حکومت اپنے ہاں شیخ الاسلامی کا عہدہ یا محکمۂ قضاء وغیرہ قائم کر دے پھر تو اس کے خلافتِ راشدہ کا نمونہ ہونے میں کوئی شبہہ ہی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس عظیم اسلامی خدمت کے بعد اس کے لیے حدود اللہ سے تجاوز، فسق و فجور کا ارتکاب، ظلم و ستم، حق ماری اور غریب آزاری سب کچھ جائز ہو جاتا تھا۔ تحریک اسلامی نے اسلامی حکومت کے ایسے تصور کی تردید کی۔ اس نے یہ چیز کھول کر بیان کر دی کہ شیخ الاسلامی کا منصب قائم کر دینے یا محض نہی منکر و امر معروف اور قضا و احتساب وغیرہ کے چند محکمے قائم کر دینے سے کوئی حکومت اسلامی حکومت نہیں بن جاتی اور اس کا قائم کردہ کوئی نظام اسلامی نظام نہیں ہو جاتا۔ اس نے بتایا کہ اسلامی حکومت وہ ہوتی ہے جو کسی شخص، خاندان، طبقے یا قوم کی حاکمیت کی بجائے اللہ کی حاکمیت اور اس کے قانون شرعی کی بالاتری کو تسلیم کرے اور جس کا نظام جمہور کی شورائی خلافت کے اصول پر قائم ہو۔ تحریک اسلامی نے حکومت کے اس اسلامی نظریے کو اس قوت کے ساتھ پیش کیا کہ آج کوئی شخص اس کے سوا کسی دوسرے نظریے کو اسلام کا نظریۂ سیاسی کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ پھر اس نے بتایا کہ ہر شعبے پر حاوی ایک مکمل اسلامی نظام زندگی کو برپا کرنے اور پھیلانے والے انتظامی ادارے کو ہی اسلامی حکومت کہا جاتا ہے۔ ایسی حکومت زندگی کے تمام گوشوں میں اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کو نافذ کرتی ہے اور خود ان احکام کی پابند اور تابع فرمان ہوتی ہے۔ کسی ملک پر کسی مسلمان شخص کا بادشاہ بن کر بیٹھ جانا اس کے اسلامی ملک یا اس کی حکومت کے اسلامی حکومت بن جانے

کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ بادشاہوں اور جابر حکمرانوں کے لیے اسلامی حکومت کے مناصب میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ اسلامی حکومت رائے عامہ کا احترام کرنے والی، مشاورت کی پابند اور قرآن و سنت کی تابع فرمان حکومت ہوتی ہے اور اس کی تمام قانون سازی کا ماخذ اصل قرآن و سنت ہوتے ہیں۔ اس کے دائرۂ اختیار میں کسی قانون کے کالعدم قرار دیے جانے اور کسی فعل کو قابلِ مواخذہ قرار دینے کے لیے اتنی ہی دلیل کافی ہوتی ہے کہ وہ قرآن و سنت کے منافی ہے۔ اسلامی حکومت کے تمام کارندے اور شہری معروف میں حکومت کی اطاعت کے پابند ہوتے ہیں اور منکر کی اطاعت کے پابند نہیں ہوتے۔ کوئی اسلامی حکومت اپنے شہریوں اور کارکنوں کو منکر کا حکم دینے کا اختیار نہیں رکھتی اور ایسے کسی حکم کو عدالت میں بھی اور بر سرعام بھی ہمیشہ چیلنج کیا جا سکتا ہے۔

تحریک اسلامی کی جدوجہد کا یہ نتیجہ ہے کہ جو بات اس کے برپا ہونے سے پہلے پڑھے لکھے لوگوں کے اندر بھی نہیں پائی جاتی تھی اور ان کے ذہن شدید غلط فہمیوں اور اُلجھاووں کے شکار تھے، آج ایک عامی مسلمان بھی مسلمان حکومت اور اسلامی حکومت کے فرق کو اچھی طرح جانتا ہے اور وہ کسی ایسی حکومت کو اسلامی حکومت تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہے جس کی گردن میں قرآن و سنت کی ہمہ پہلو اطاعت کا قلادہ موجود نہ ہو۔ اسلامی حکومت کے بارے میں ایسا نکھرا ہوا تصور اجاگر کرنے میں تحریک اسلامی نے زبردست کامیابی حاصل کی ہے۔

اسلامی قومیت اور مسلم قومیت کا فرق صدیوں کے جمود و انحطاط کے نتیجے میں مسلمانوں کے اندر بھی قومیت کا وہی تصور رائج ہو گیا تھا جو دنیا کی عام کافر قوموں میں پایا جاتا ہے، جس کی بنیاد نسل رنگ زبان علاقہ جغرافیائی حد بندی یا بعض مشترک تہذیبی اور ثقافتی اطوار پر قائم ہے۔ چنانچہ آزادی کے لیے مسلمان دوسری قوموں سے اپنے علیحدہ قومی تشخص اور سیاسی جدوجہد کی بنیاد قومیت کے اسی نسلی تصور پر رکھتے تھے۔ لیکن تحریک اسلامی نے قومیت کے اس جاہلی تصور کے مقابلے میں اسلامی نظریاتی قومیت کا تصور پیش کیا اور کھول کھول کر بتایا کہ درحقیقت مسلمان ایک نظریاتی گروہ اور ایک اصولی جماعت ہیں۔ مسلمان کی قومیت اس کے دین میں پوشیدہ ہے۔ وہ اسلام کی نسبت سے مسلمان ہے اور مسلمان کی حیثیت سے ہی ایک علیحدہ ملت بن کر وجود میں آتا ہے۔ جس درجہ میں وہ اسلامی خصوصیات سے بہرہ ور ہو اسی قدر وہ مسلمان ملت کے لیے مفید۔۔۔ اس کے مرکز وفاداری سے قریب تر، اور اس سے مضبوطی کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے، اور جس قدر وہ اسلامی تقاضوں سے بے نیاز ہو اسی قدر وہ ملت کے مرکز وجود سے ناآشنا اور ناقابل اعتبار ہوتا ہے۔ مسلم قوم پرستی اس معنی میں بے اصل ہے کہ مسلمان جو کچھ بھی کرے وہ اسلامی ہے۔ یا دنیا کی دوسری قوموں کے تصورات کے مطابق وہ اس معنی میں کوئی

قوم ہے کہ مسلمانوں کے مادی مفاد کے لیے وہ جو کچھ بھی کرے وہ اسلامی ہے اور اسے خدمتِ دین و اسلام ہی شمار کیا جائے۔ بقول علامہ اقبالؒ ؎

اپنی ملّت کو قیاس اقوامِ مغرب پر نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ

ظاہر ہے کہ وہ خاص ترکیب خالص اسلامی اور نظریاتی ہے۔ اس کا تعلق نسل یا علاقے یا رنگ و زبان سے نہیں ہے۔ اگر کسی مسلم گروہ کا سو فیصدی مادی مفاد بھی کسی غیر اسلامی طرزِ عمل سے وابستہ ہو تو وہ کسی مصلحت کے پیشِ نظر بھی اس مادی مفاد کی خاطر غیر اسلامی طرزِ عمل اختیار کرنے کا مجاز نہیں ہے۔ اور یہ تصور تو سرے سے ہی غلط ہے کہ مسلمان قوم کا ہر فعل اپنے آپ اسلامی فعل ہوتا ہے اور کسی غلط کاری میں مبتلا ہونے کے لیے یہ جواز کافی ہے کہ اس غلط کاری میں فلاں مسلمان ملک کی حکومت یا وہاں کے مسلمان عوام بھی مبتلا ہیں۔ یہودیوں کی طرح پستی میں گرنے کا یہ نسخہ مسلمانوں کے لیے جائز نہیں ہے۔ تحریکِ اسلامی نے اسلامی قومیت اور مسلم قومیت کے اس فرق کو کھول کھول کر بیان کیا ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں کے اندر غیر مسلم قوموں کے طرزِ عمل کی پیروی میں یہ غلط فہمی کثرت سے پائی جاتی تھی۔ چنانچہ اگر انہیں باطل کی خدمت یا حرام کی دولت میں بھی مسلمانوں کا کوئی مادی مفاد پوشیدہ نظر آتا تھا تو مسلمان رہنما اسے اسلامی مطالبہ قرار دے کر اس کے حصول کے لیے آزاد اٹھانے لگتے تھے۔ لیکن تحریکِ اسلامی نے اپنی زبردست جدوجہد سے اس غلط فہمی کو بلکسر دور کر دیا۔ آج مسلمانوں کا اہلِ علم گروہ مسلم قومیت اور اسلامی قومیت کے اس فرق سے پوری طرح آگاہ ہے اور جانتا ہے کہ مسلمانوں کی بنائے اجتماع مشترکہ مادی مفادات پر مبنی مسلم قومیت نہیں بلکہ اسلامی قومیت ہے۔ آج بھی یہ غلط فہمی اگر کسی گوشے میں آثارِ قدیمہ کے طور پر پائی جاتی ہے تو تحریکِ اسلامی کی مساعی اسے رفع کرنے میں صرف ہو رہی ہیں۔

کتاب و سنت کا نفاذ جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں میں صدیوں کے انحطاط اور مغربی مستشرقین کے افکار سے متاثر ہونے کے سبب یہ بات عام طور پر پھیلی ہوئی تھی کہ اسلام کے نظامِ قانون کا ماخذ صرف قرآن پاک ہے اور ظاہر ہے کہ اس کی تعبیر و تشریح میں جب ہر شخص آزاد ہوگا اور قرآن و حدیث کے علوم سے بے بہرہ لوگ مغربی قوانین کو سامنے رکھتے ہوئے جب اس کی تشریح کریں گے تو جدید قانون ساز اداروں کے لیے کوئی متعین معیارِ رد و قبول باقی نہ رہے گا۔ اس طرح اس کتاب الٰہی کی ہزاروں تعبیریں ہو جائیں گی اور بالآخر کثرتِ تعبیر کے ہنگامے

میں وہی تعبیر معتبر شمار ہو گی جو مغرب زدہ حضرات کے روزمرہ کے مشاغل میں قطعاً رکاوٹ ڈالنے والی نہ ہو۔ تحریک اسلامی نے اپنے زبردست علمی کام اور پرزور استدلال سے اہل علم حضرات سے یہ بات منوا لی کہ اسلامی قانون کا ماخذ کتاب اللہ کے ساتھ سنت رسولؐ اللہ بھی ہے اور سنت رسولؐ اللہ کو نظرانداز کر کے کوئی قانون سازی بھی اسلامی خطوط پر استوار نہیں کی جا سکتی۔ کتاب و سنت کی اصطلاح ایک جامع اور لازم و ملزوم اصطلاح ہے جس کے بغیر کسی قسم کے اسلامی قانون کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ درحقیقت سنت قرآن پاک کی ایک مستند اور معتبر ترین تفسیر و تشریح و تعبیر ہے اور وہی اس کے ظاہر و باطن احکام کی توضیح و تفصیل بیان کرتی ہے۔ اس سلسلہ میں اگرچہ اسلام سے آزادی چاہنے والے حضرات نے بہت زور مارا اور بہت سے قلمی و صحافتی معرکے برپا کیے لیکن آج یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ کتاب اللہ کے ساتھ ساتھ سنت رسولؐ اللہ بھی اسلامی قانون کا معتبر ترین ماخذ مانی جا رہی ہے اور سب سے زیادہ ملک کے قانون داں طبقہ نے اسے مان لیا ہے جو کسی دوسرے کے منوانے سے اس کو مشکل ہی مان سکتا تھا۔ تحریک اسلامی کی یہ کامیابی بھی کسی صورت نظرانداز نہیں کی جا سکتی۔

ذہنی مرعوبیت کا خاتمہ جس قوم کی تلوار سے کوئی قوم مفتوح ہوتی ہے تدریجاً اسی قوم کے تصورات و خیالات و نظریات سے بھی وہ مفتوح و مغلوب ہو جاتی ہے۔ ذہنی مرعوبیت کے بغیر کوئی قوم مفتوح نہیں ہوتی اور اگر کسی حادثے سے مفتوح ہو بھی جائے تو بہت جلد اپنی آزادی حاصل کر لیتی ہے۔ مسلمانوں نے سلطنت کھوئی تو ساتھ ہی اپنی خودی اور عرفانِ ذات سے بھی محروم ہو گئے اور ان کے دل و دماغ پر مغرب کی مرعوبیت اس طرح مسلط ہوئی کہ ان کے لیے وحی والہام کی تعلیمات تو بے دلیل تسلیم کرنا مشکل ہو گیا البتہ مغرب کے آسمان سے اتری ہوئی ہر بات ان کے لیے وحی والہام بن گئی مغرب کے فلسفیوں کے نظریے درست قرار پائے۔ اُنہی کے قوانین ترقی پسند شمار ہونے لگے۔ ان کی زبان فخر و مباہات کا ذریعہ اور تعلیم یافتہ ہونے کی علامت بن گئی۔ ان کا لباس خلعتِ فاخرہ بن گیا اور ان کے نظریات و تصورات ہی مسلمانوں کے لیے دنیوی ترقی کی علامت اور سند قرار پا گئے

تحریک اسلامی نے اپنی جدوجہد سے مرعوبیت کا یہ طلسم توڑا۔ مغرب کے نظریات پر بھرپور تنقید کی جس کا آغاز حکیم مشرق علامہ اقبالؒ کر چکے تھے۔ اُس کے فلسفے کو تحریک نے بے بنیاد ثابت کیا۔ اس کی تہذیب کے اطوار کو دلیل سے جاہلانہ قرار دیا۔ اس کے شعائر کو بے دینی کی علامت ثابت کیا۔ اور اپنے زبردست

استدلال سے اہلِ مغرب کے پیش کردہ سارے طلسمِ خیال کا تار و پود بکھیر دیا۔ اس فکری یلغار کے نتیجے میں مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقے میں سے مغرب کی مرعوبیت بتدریج کم ہوتی چلی گئی۔ نئی نسل میں عرفانِ ذات کا احساس ابھرا اور وہ لوگ جو مغرب کو علم کے ہر میدان میں سند کے طور پر پیش کرتے تھے وہ اسلامی شعائر اور کتاب و سنت کی تعلیمات کو سند کے طور پر پیش کرنے لگے۔ اس طرح تحریک اسلامی نے یورپ کی مرعوبیت کا جادو دئے سامری زائل کر دیا اور مسلمانوں میں اپنی روایات پر فخر اپنی تعلیمات پر بھروسہ اور اپنی تہذیب و کلچر پر اعتماد کو بحال کیا۔ (باقی)

(بقیہ مطبوعات)

زیرِ نظر کتاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف اُن تعلیمات کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن کا تعلق صحت و حفظانِ صحت، اسبابِ مرض اور علاج معالجہ و پرہیز سے ہے۔ علاوہ ازیں کھانے پینے کے آداب اور نشست و برخاست کے وہ اصول بھی بیان کیے گئے ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر صحت و تندرستی کی ضمانت مل سکتی ہے۔ آنحضرتؐ کی مرغوب غذائیں۔ مخصوص بیماریوں کے لیے آپ کے بیان کردہ علاج اور بیماروں کی عیادت کا اسلامی طریق وغیرہ مباحث بھی داخلِ کتاب ہیں۔

ہماری رائے میں مسلم اکادمی کی یہ پیشکش بہت کچھ افادیت کی حامل ہے اس لیے مسلم معاشرہ کے ہر فرد کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ لیکن ایک بات کی اصلاح مرتب اور ناشر کے ذمہ ہے اور وہ ہے عربی عبارات میں کتابت و اعراب کی بکثرت غلطیاں مثال کے طور پر صـ۹۷ پر ایک چار سطری حدیث میں ایسی سات آٹھ غلطیاں نظر پڑتی ہیں۔ کم و بیش یہی حال دوسرے مقامات کا بھی ہے۔ ان کی اصلاح از حد ضروری ہے۔

مطبوعات

تاریخ پاکستان کے بڑے لوگ | مرتب۔ ثروت صولت۔ ناشر۔ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ۱۳۔ای شاہ عالم مارکیٹ لاہور سفید کاغذ۔ کتابت طباعت عمدہ۔ کتابی سائز کے ۲۵۶ صفحات۔ قیمت ۵۰/ ۵ روپے۔

یہ کتاب جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے تاریخ پاکستان کے بڑے لوگوں کے حالات سے روشناس کراتی ہے۔ اور مؤلف کا مقصدِ تالیف بھی یہ ہے کہ نوجوان نسل اس کتاب کا مطالعہ کرکے اس امر سے واقف ہو جائے کہ مملکت پاکستان کیوں وجود میں آئی؟ تحریک پاکستان کے اولین محرک کون لوگ تھے؟ اور بعد میں کن حضرات کی مساعی نے اس تحریک کو پروان چڑھایا۔ نیز پاکستان کی تاریخ کے بڑے لوگ کس تہذیب و تمدن کے علمبردار تھے۔

زیرِ تبصرہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول۔ پاکستان میں محمد بن قاسمؒ کی آمد سے شروع ہوتا ہے جنہوں نے یہاں اسلامی تہذیب کی بنیاد رکھی۔ اور شیخ علی ہجویریؒ کی خدماتِ دینی پر ختم ہو جاتا ہے۔ بابِ دوم اسلامی تہذیب کے توسیع و استحکام کے دور کی روداد ہے۔ باب سوم مسلم حکمرانوں اور دیگر محبِّ اسلام عناصر کے عروج و ترقی کی داستان ہے۔ بابِ چہارم میں مسلمانوں کے عہد زوال کا نقشہ کھینچا گیا ہے نیز احیائے اسلام کی تحریکوں کے سربراہوں کا تذکرہ ہے۔ اور آخری باب میں بانی پاکستان اور تحریک پاکستان کے دوسرے مخلص اکابر کے سوانح زندگی دیے گئے ہیں۔

ہماری رائے میں یہ کتاب مفید اور دلچسپ ہے۔ خصوصاً تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لیے اس کا مطالعہ بہت ضروری ہے تاکہ وہ اپنے شاندار ماضی سے آگاہ ہو سکیں اور اپنے عظیم اسلاف کے حالاتِ زندگی پڑھ کر اُن جیسا بننے کی کوشش کریں۔ ایک بات البتہ تبصرہ نگار کو بہت محسوس ہوئی ہے اور وہ ہے اس کتاب کا مولانا اشرف علی تھانویؒ۔ مولانا محمد علی جوہر اور بعض دیگر اکابر کے تذکرہ سے خالی ہونا۔ ان حضرات کی اسلامی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ علاوہ ازیں انتخابِ شخصیات میں جن حدود و قیود کو ملحوظ رکھا

گیا ہے وہ بھی ہمارے نزدیک درست نہیں۔ پاکستان صرف پاکستان میں رہنے والوں نے ہی نہیں بنایا بلکہ اس کا قیام پورے برصغیر کے مسلمانوں کی مشترکہ مساعی کا نتیجہ ہے۔ امید ہے کہ فاضل مولف اور ناشر آیندہ ایڈیشن میں اس کا خیال رکھیں گے۔

ہفت روزہ آئین کا تفہیم القرآن نمبر ناشر۔ فضل الرحمن رومی۔ ملنے کا پتہ دفتر ہفت روزہ آئین نسیم مارکیٹ ۲۱۔ ریلوے روڈ لاہور۔ ضخامت ۳۱۶ صفحات۔ کتابت طباعت عمدہ۔ سفید کاغذ۔ قیمت ۹/۰۰ روپے

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی شہرہ آفاق تفسیر تفہیم القرآن کی تکمیل پر ہفت روزہ آئین کا جو خاص نمبر منظر عام پر آیا ہے وہ اس لحاظ سے کافی افادیت کا حامل ہے کہ اس میں تفسیر اور مفسر کے بارے میں بعض نامعلوم حقائق اور بہت سی معلوم مگر بکھری ہوئی باتیں یکجا صورت میں مل جاتی ہیں۔

تین سو صفحات پر پھیلا ہوا یہ نمبر چھ حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں بنام فکر و نظر۔ تفہیم القرآن کی موجودہ دور میں اہمیت بیان کی گئی ہے اور ممتاز اہل قلم نے اپنے وقیع مقالات میں ثابت کیا ہے کہ علمی محاذ پر دورِ جدید کے ہر چیلنج کا مقابلہ یہ تفسیر نہایت کامیابی کے ساتھ کرتی ہے۔ دوسرا حصہ خود صاحب تفسیر کے اپنے قلم و زبان سے ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ تفسیر لکھتے وقت ان کے پیشِ نظر کیا مقصد تھا؟ اور یہ تفسیر کن حالات میں لکھی گئی ہے۔ تیسرے حصہ میں تفہیم القرآن کی مختلف زبانوں میں اشاعت کا تذکرہ ہے۔ چوتھا حصہ جس کا عنوان ہے۔ تفہیم القرآن پڑھتے ہوئے۔ اہلِ علم و فضل کے ان تاثرات پر مشتمل ہے جو مطالعۂ تفسیر کے دوران خود انہوں نے قائم کیے یا اپنے ماحول پر قائم ہوتے دیکھے۔ پانچواں حصہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے حالاتِ زندگی اور تفہیم القرآن کے اسلوبِ تحقیق و تصنیف سے متعلق ہے۔ اور آخری حصہ ایک مجلسِ مذاکرہ ہے جس میں علمائے کرام، جج صاحبان، وکلاء، ادباء، اساتذہ اور طلبہ نے حصہ لیا ہے۔ اور تفہیم القرآن کے بارے میں مختلف سوالات کے جوابات دیے ہیں۔ کوئی شک نہیں کہ آئین کے زیرِ تبصرہ نمبر نے تفہیم القرآن کی حقیقی اہمیت اور قدر و قیمت اجاگر کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے ایک عام قاری کے اندر اصل تفسیر کو دیکھنے اور پڑھنے کی زوردار تحریک پیدا ہو جاتی ہے۔

اس قابلِ قدر نمبر میں جسے صحیح معنوں میں دستاویز کہنا چاہیے تبصرہ نگار کو اردو اور عربی کتابت کی متعدد غلطیاں نظر آئی ہیں بحیثیتِ مجموعی آئین کا تفہیم القرآن نمبر ایک اچھی کوشش ہے جس کی اشاعت پر ہم محترم ناشر

اور فاضل مرتبین کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

معرکۂ فرعون وکلیم | مولف: اخلاق حسین صاحب۔ ناشر۔ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ۱۳۔ ای شاہ عالم مارکیٹ لاہور۔ کتابت طباعت عمدہ۔ سفید کاغذ ۲۱۲ صفحات قیمت ۷/- روپے

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی کشمکش، قصص قرآن میں سے ایک اہم قصہ ہے جس میں ہر دور کے علمبرداران حق وصداقت کے لیے متعدد نصائح وعبر اور کئی اسباقِ عزیمت واستقامت موجود ہیں۔ جن کو اگر سامنے رکھا جائے تو انتہائی نامساعد حالات میں بھی کوئی داعیٔ حق افسردگی ومایوسی کا شکار نہیں ہو سکتا۔ اس قصے کا یہی وہ تحریکی پہلو ہے جسے زیرِ تبصرہ کتاب میں اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ آج کے دل شکن حالات میں اس کا مطالعہ دعوتِ دین کا کام کرنے والوں کے لیے موجب تقویت بن سکے۔

بہتر ہوتا اگر قصۂ فرعون وکلیم مرتب کرتے وقت ذخیرۂ حدیث وتفسیر سے بھی مدد لی جاتی۔ اس صورت میں بعض واقعات ضروری تفصیل کے ساتھ اور زیادہ موثر انداز میں سامنے آتے اور کوئی تشنگی محسوس نہ ہوتی جس سے بحالتِ موجودہ انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر معجزاتِ موسیٰ، مسلسل تنبیہاتِ الٰہی، خسفِ قارون اور دیگر مباحث۔ لیکن اب تو بائے بسم اللہ سے لے کر تائے تمت تک کتاب میں قاری صرف دو چیزیں دیکھتا ہے۔ آیاتِ قرآن اور مؤلف کا اپنا استدلال واستنتاج۔ کہیں کہیں ایک ہی مفہوم کی آیات کا تکرار بھی پایا جاتا ہے جس کی کوئی توجیہہ تبصرہ نگار نہیں کر سکا۔

بحیثیتِ مجموعی معرکۂ فرعون وکلیم ایک اچھی کوشش ہے اور تحریکِ اسلامی کے کارکنوں کے لیے اس کا مطالعہ مفید رہے گا۔

طبِ نبوی | مرتبہ، حافظ نذر احمد صاحب۔ ناشر مسلم اکادمی۔ نذر منزل علامہ اقبال روڈ لاہور۔ کتابت طباعت گوارا۔ سفید کاغذ پر کتابی سائز کے ۲۴۰ صفحات قیمت ۴۶۵۰ روپے

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حیاتِ انسانی کے جملہ امراض کا مداوا بن کر آئے تھے، زندگی کا ظاہری و باطنی پہلو ہو یا جسمانی و روحانی آپ نے دونوں کی طرف توجہ دی دونوں کا تزکیہ فرمایا اور دنیا و عقبیٰ میں عالمِ انسانیت کو حقیقی سعادت سے ہمکنار کر دیا۔ (باقی صفحہ ۴۴ پر)

(بقیہ اشارات)

عدل و انصاف کا خون کرنے لگتا ہے۔ اور جو بھی اس راہ میں مزاحم ہو وہ اسے ظلم و ستم کا نشانہ بناتا ہے۔ اس کی اس انسانیت سوز روش کو دیکھتے ہوئے نیک اور بھلے آدمی اس سے منہ موڑ لیتے ہیں کسی صاحب ضمیر کے لیے ظلم اور ناانصافی کو دیکھنا بھی بہت مشکل ہوتی ہے کجا کہ وہ اس کا مویداور حامی بن جائے۔ با اصول اور خدا ترس انسانوں کے الگ ہو جانے سے جو خلا پیدا ہوتا ہے اسے خوشامدیوں سے پُر کیا جاتا ہے اور اس طرح ایک آمر پر جرائی کی گرفت اچھی طرح مضبوط ہو جاتی ہے۔ اس گرفت سے آزاد ہونے کا ایک ہی راستہ ہے کہ آمر مطلق سب سے پہلے اپنے ذہن سے اس باطل خیال کو نکالنے کی کوشش کرے کہ وہ عقل کل ہے اور اس سے کوئی غلطی سرزد ہی نہیں ہو سکتی اور جو فرد بھی اس کے انداز فکر سے ہٹ کر سوچتا ہے وہ لازمی طور پر ملک و ملت کا دشمن ہے اور اس بنا پر گردن زدنی ہے۔ کوئی آمر جب تک اپنے اس انداز فکر میں خوشگوار تبدیلی پیدا نہیں کرتا اس وقت تک اصلاح احوال کی کوئی صورت ممکن نہیں ہو سکتی لیکن اگر وہ ذرا ہمت اور جرأت سے کام لے کر یہ حقیقت ذہن نشین کر لے کہ وہ بہر حال انسان ہے اور اس سے غلطی کا صدور ناممکن نہیں تو پھر اس کے خیالات کے اندر اتنی وسعت پیدا ہو سکتی ہے کہ وہ اختلاف رائے کو برداشت کرے اور ان لوگوں کی باتوں کو بھی توجہ سے سُنے جن کے سوچنے کا انداز اس سے مختلف ہوتا ہے۔ قلب و نگاہ کی وسعت سے اس کے اندر حوصلہ، تحمل اور بُردباری پیدا ہو گی اور وہ اپنے مخالفین کو ہر وقت خوفناک قسم کی دھمکیاں دینے کے بجائے اُن کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش کریگا جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ کھرے اور مخلص لوگ بالواسطہ اور بلاواسطہ امور مملکت میں اس کا ہاتھ بٹانے پر آمادہ ہو جائیں گے اور اس طرح آہستہ آہستہ یہ آمر برائی کے چنگل سے نکل کر خیر اور بھلائی کی راہ پر گامزن ہو گا جس سے قوم اور وطن اور خود اس کی اپنی ذات کو فائدہ پہنچے گا اور وہ تاریخ میں ایک ظالم اور ستمگر حکمران کی حیثیت سے یاد رہنے کے بجائے ایک عادل فرمانروا کی حیثیت سے یاد رکھا جائیگا اور آنے والی نسلیں اُس پر لعنتیں بھیجنے کے بجائے اس کا نام عزت و احترام سے لیا کریں گی۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تفسیر تفہیم القرآن

ہمارے درج ذیل ایجنٹ حضرات سے دستیاب ہو سکتی ہے

۱- اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، شاہ عالم مارکٹ لاہور

۲- فیروز سنز لمیٹڈ، دی مال، لاہور

۳- مکتبہ تنویر القرآن اُردو بازار لاہور

۴- نورسی پبلیکیشنز، لیاقت آباد کراچی

۵- مکتبہ تعمیر افکار اسلامی بالائی منزل حسین ڈیکوریشن ناظم آباد کراچی

۶- شیخ سنز، اُردو منزل، اُردو بازار کراچی

۷- کراچی بک ڈپو ۸۴ اُردو بازار کراچی

۸- اقبال بک ڈپو سمرسٹ سٹریٹ صدر کراچی

۹- مسعود علی رضوی رضوان آباد فیڈرل بی ایریا منصورہ کراچی ۳۸

۱۰- اتحاد بک ڈپو، گاڑی کھاتا حیدر آباد

۱۱- مکتبہ اسلامی، کورٹ روڈ حیدر آباد

۱۲- رحمان نیوز ایجنسی، شارع فاطمہ جناح کوئٹہ

۱۳- گوشۂ ادب سرکلر روڈ کوئٹہ

۱۴- مکتبہ اسلامی معرفت دفتر جماعت اسلامی جیکب آباد

۱۵- مصاحب علی صاحب امیر جماعت اسلامی نواب شاہ

۱۶- عجائب سٹورز (رجسٹرڈ) فریئر روڈ سکھر-

۱۷- مکتبۂ تعمیر ملت ڈہرکی ضلع سکھر-

۱۸- ملت بک ڈپو ریلوے روڈ رحیم یار خاں

۱۹- عزیز اینڈ سنز شاہی بازار لاڑکانہ

۲۰- امداد علی قادری مکتبہ اسلامی قنبر علی خاں

۲۱- مکتبۂ احیائے ملت کپ بازار ملتان

۲۲- ضیا بک ڈپو، چمن بازار ہارون آباد

۲۳- قاری محمد عبداللہ صاحب مسجد گول چوک اوکاڑہ

۲۴- لال دین سلیم امیر جماعت اسلامی، لائل پور

۲۵- حاجی دین محمد صاحب ماموں کانجن

۲۶- ادارۂ امتیاز کمالیہ

۲۷- خان زمان خان اینڈ کو، غلہ منڈی سرگودھا-

۲۸- چوہدری راجولی صاحب مشین محلہ جہلم-

۲۹- مولوی غلام رسول صاحب منڈی بہاء الدین

۳۰- مکتبہ افکار اسلامی ۱۵۱۲ بازار تلواڑاں راولپنڈی-

۳۱- مکتبہ اسلامیہ منڈی بازار لالہ موسیٰ

۳۲- عبدالعزیز دوکان ۵ - ۲۱- ایریا مارکیٹ واہ کینٹ

۳۳- شیخ سعید احمد خاکسار مارکیٹ فاروق جنرل سٹور ڈی جی خان

۳۴- خواجہ محمد یونس کندھکوٹ

۳۵- حکیم محمد اسحاق حویلیاں (۳۶) فیض محمد ہری پور ہزارہ

۳۷- شوکت کریانہ سٹور، مانسہرہ

۳۸- مکتبہ اسلامی، بنک روڈ، مردان

۳۹- عزیزیہ کتب خانہ چوک صرافہ بازار ڈیرہ اسمٰعیل خان

۴۰- عبدالرحمٰن شاہ خطیب جامع مسجد غزنی خیلاں بنوں شہر

۴۱- ضیاء بک ڈپو بنیور روڈ منگورہ

۴۲- میاں محمد شفیع صاحب آئرن مرچنٹ جناح چوک میاں چنوں

۴۳- حاجی محمد اسماعیل مکتبہ اسلامی برتن منڈی میر پور خاص

۴۴- یونائیٹڈ بکسیلرز اینڈ سٹیشنرز اُردو بازار کراچی

۴۵- سردار محمد اشرف خاں صاحب- آزاد کشمیر کلاتھ اینڈ جنرل سٹور بالمقابل ہائی سکول غازی-

۴۶- پاک نیوز ایجنسی سٹیشنرز اینڈ بکسیلرز تربت ضلع مکران